حمید اختر

کال کوٹھری

پائنیر پبلشرز (رجسٹرڈ)

۶۵- ٹمپل روڈ - لاہور

قیمت .... اڑھائی روپے

تعداد طبع اول .... گیارہ سو

پرنٹر .... سویا آرٹ پریس لاہور

پبلشر .... پائنیر پبلشرز لاہور

حبیب پاسلوی

کے نام

ایک رات
سیاست خانہ
پھانسی کی کوٹھریاں
ڈسٹرکٹ جیل ملتان

پولیس والے دروازہ کھٹ کھٹا رہے ہیں اور تمہیں پوچھ رہے ہیں ذرا اُٹھ کر دیکھو۔"
جب میں نیچے اترنے لگا تو اس نے کہا "کیا آج پھر تلاشی ہو گی؟" میں نے
کوئی جواب نہ دیا۔

نیچے اتر کر میں نے دروازہ کھولا تو ایک سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر، ایک تھانے دار،
ایک سی۔ آئی۔ ڈی کنسٹیبل اور ۷ سپاہی موجود تھے۔ میں نے ان سب کو نیچے کے کمرے
میں بٹھا کر کہا "فرمائیے!"

سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر نے ایک ٹائپ شدہ فل سکیپ کاغذ میرے ہاتھ میں دیتے
ہوئے کہا "یہ آپ کا وارنٹ گرفتاری ہے۔ ہم آپ کو دس منٹ کپڑے تبدیل کرنے کے
لئے دیتے ہیں، آپ کپڑے تبدیل کر لیجئے، وارنٹ پر دستخط بھی کر دیجئے اور پھر ہمارے
ساتھ چلئے!"

میں نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی۔ میرے اعصاب ایک لمحہ کے لئے تنے اور پھر
اصلی حالت پر آ گئے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں یہ منحوس خبر اپنی بہن کو کس طرح سناؤں گا
جو میری گرفتاری کے بعد اس اجنبی شہر میں بالکل تنہا رہ جائے گی۔

اس پریشانی میں میں نے وارنٹ پورا نہیں پڑھا، صرف اس قدر پڑھا "گورنر پنجاب
کو اطمینان ہے کہ حمید اختر کی حرکات اس قسم کی ہیں کہ وہ کچھ گڑبڑ کرنے والا ہے اس لئے
سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت اسے ۶ ماہ کے لئے احتیاطی نظر بندی میں رکھا جاتا ہے"
وارنٹ پر دستخط کر کے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں

یہ سوچ کر ہنسا کہ آخر آج وہ سیفٹی ایکٹ اس گھر میں بھی آ گیا جس کے خلاف ہر ہفتے تم پچھلے ڈھائی سال سے اخباری مضامین لکھتے رہے ہو۔ پہلے تو لوگوں کی گرفتاری پر لکھتے تھے اب کیا کرو گے؟

جب میں اوپر پہنچا تو میری بہن بہت پریشان تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ پندرہ سال کی پلورسی۔ جگر اور انتڑیوں کی خرابی نے اس میں کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک اور جانگداز منزل، ایک نئی مصیبت اور نئی طرح کی اذیت تھی۔

یہ سوچ کر مجھے ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی مگر میں نے کوشش کر کے اپنے حواس جمع کئے اور کپڑے تبدیل کر کے اس سے کہا "مجھے ذرا کچھ پوچھ گچھ کرنے کے لئے تھانے میں بلایا ہے، دو تین گھنٹے تک لوٹ آؤں گا"

یہ سن کر اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی مگر مجھے اپنے جھوٹ بولنے پر سخت اذیت ہوئی لیکن میں اسے اس لمبی جدائی کے بارے میں بتا کر اپنے سامنے روتے ہوئے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی اس لئے میں اپنے اس جھوٹ میں کامیاب ہو گیا۔

مکان کے باہر تانگہ کھڑا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر نے کہا "تانگہ میں ہم آپ کو پرانی انار کلی تھانے میں لے چلیں گے کیونکہ آپ کا محلہ سنت نگر اسی تھانے میں ہے۔ وہاں سے بذریعہ موٹر آپ کو سنٹرل جیل پہنچا دیا جائے گا"

تانگہ جب مکان کے سامنے سے چلا تو میری نظر اپنے مکان کی کھڑکی پر پڑ گئی، وہاں

بہن کو کھڑے دیکھ کر میں نے پولیس والوں سے زبردستی بات چیت کرنے اور ہنسنے کی کوشش کی تاکہ وہ سمجھ لے کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ چنانچہ جب تک تانگہ مکان کے سامنے رہا میں بے وقوفی کے جملے بولتا اور خواہ مخواہ قہقہے لگاتا رہا۔

تانگہ جونہی موڑ پر سے مڑا تو میں نے انسپکٹر صاحب سے پوچھا "کیا میں اکیلا ہی گرفتار ہوا ہوں یا اور لوگ بھی ہیں؟"

اس نے کہا "اور لوگ بھی ہیں۔ آپ نام لیجئے تو میں بتلاؤں کون لوگ ہیں!"

پہلے تو مجھے اور لوگوں کی گرفتاری پر بے حد خوشی ہوئی پھر میں نے سب سے پہلے ندیم کے بارے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے ندیم صاحب اب تک گرفتار ہو گئے ہوں گے" انسپکٹر نے کہا۔

"اور محمد افضل؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی آپ کے ساتھ ہی ہے" انسپکٹر نے کہا "زیادہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گرفتاریاں پورے ملک میں ہوئی ہیں، آپ کے بہت سے دوست اندر ملیں گے۔"

بہت سے دوستوں کی گرفتاری اور ساتھ ہونے کی خبر سُن کر میری باچھیں کھل گئیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی کمینگی کا احساس ہوا۔ بالخصوص ندیم تو تین سال کی بیکاری اور زبوں حالی کے بعد ابھی دو ماہ پیشتر ہی کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوئے تھے ورنہ اس سے پہلے تو ہندوپاکستان کے اس رُومانی شاعر اور افسانہ نگار کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی۔

ان کو دیکھ کر اکثر مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ ایسے حالات میں ندیم کا دماغ کیسے صحیح رہتا ہے، ادب اور فن کے سلسلے میں جتنی محنت اور مشقت انہوں نے کی ہے اس دور کے لکھنے والوں میں بہت کم ہوں گے جو ان کا مقابلہ کر سکیں۔

اب بھی لوگ ان کی کتابوں کو خریدتے ہیں، پڑھتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں اور مصنف پریشان حال بیکار ہے۔ پھر جب دو ماہ پیشتر اس نے تنگ آ کر فلم والوں کی نوکری قبول کر لی اور باقاعدہ آمدنی کا سلسلہ ہو گیا تو ہم سب کس قدر خوش ہوئے تھے۔

ابھی یہ خوشی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ آج یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن پھر بھی دل کے کسی گوشے میں یہ خوشی ضرور تھی کہ جیل میں انکا ساتھ رہے گا۔

نئی منزل

پرانی انارکلی کے ٹیلیفون والے کمرے میں ہم سب جا کر بیٹھ گئے انسپکٹر صاحب نے کار کے لئے دو دفعہ ٹیلیفون کیا مگر اس دن بہت سی گرفتاریاں ہونے کی وجہ سے پولیس کی گاڑیاں بے حد مصروف تھیں اس لئے ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ گاڑی ابھی تھوڑی دیر تک نہیں مل سکے گی۔ گاڑی کی طرف سے مایوس ہو کر انسپکٹر صاحب نے مجھ سے کہا "ابھی کچھ دیر رکنا پڑے گا، آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتلائیے، چائے وغیرہ منگواؤں؟"

مزے کی بات یہ ہے کہ میں خود جلد سے جلد جیل میں پہنچ کر دوستوں سے ملنا چاہتا تھا میں نے کہا "چلئے وہیں چل کر پئیں گے۔ اگر کار نہیں مل سکتی تو تانگہ ہی میں چلے چلئے"

چنانچہ تانگہ میں بیٹھ کر ہم لوگ سنٹرل جیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

۱۰ مئی کی یہ صبح بڑی سہانی اور بڑی اُجلی صبح تھی۔ مگر مجھے وہ بہت ہی ویران اور اداس نظر آئی۔ ابھی پو پھٹی ہی تھی اور مشرق کی طرف سے روشنی کا سیلاب بڑھا آرہا تھا۔ سڑکوں پر اِکا دُکا مسافر نظر آنے لگے تھے۔ کارخانوں میں جانے والے مزدور ٹوٹے ہوئے سائیکلوں پر سوار تیزی سے بھاگے جا رہے تھے۔ شہر کی سڑکوں پر کارپوریشن کے بھنگی جھاڑو دے رہے تھے اور فضا میں گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ تانگہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے اس سارے منظر کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔ ایک دنیا، زندہ حرکت کرتی ہوئی خوبصورت حسین دنیا میرے پیچھے چھوٹی جا رہی تھی اور ایک اجنبی مردہ لاش کی طرح بے حرکت زندگی سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ آئندہ کیا ہوگا؟ میرے بعد میری بہن کیسے رہے گی؟ سگرٹ کے کش لیتے ہوئے میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا۔ تانگہ جیل روڈ پر چل رہا تھا۔

سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر نے مجھ سے کہا "آپ پر کمیونسٹ پارٹی کے مرکز کو بہت اعتماد ہے نا؟"

میں نے کہا "قبلہ اگر میری گرفتاری کی یہ وجہ ہے تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ کیونکہ اگر کوئی دوسرا مجھ پر اعتماد کرتا ہے تو اس میں مجھے گرفتار کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ اس بات کو اُلٹ کر کہیں اور مجھے کمیونسٹ پارٹی پر اعتماد رکھنے کے جُرم میں پکڑ لیں تو کوئی بات بنتی ہے ——"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا

"تانگہ جب جیل روڈ پر پہنچا تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مگر جیل کے گھنٹے سے چھ بجنے کی آواز آئی۔ انسپکٹر صاحب نے اپنی بھویں پھیلاتے ہوئے مجھ سے کہا "یہ گھنٹہ جیل کا ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"آپ مدت تک اس تنبیری گھنٹے کی آواز سنتے رہیں گے۔ یہی سنانے کے لئے آپ لوگ یہاں لائے گئے ہیں" اس نے کہا "مجھے آپ لوگوں کی جوانی اور آپ کے کیریر کا خیال آتا ہے۔ آپ لوگ ملک کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی تباہ کر رہے ہیں"

میں نے اس کا جواب اپنے دل میں دیا کہ "ملک کو کون تباہ کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ اور اپنی جوانی کی تباہی پر تو مدت ہوئی ہم نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے"

جیل کے نزدیک پہنچکر اس نے پھر کہا "ذرا یہ تو بتلائیے کہ محمد افضل کی جو شادی پچھلے دنوں ایک انگریز عورت سے ہوئی ہے اس میں جسمانی محبت کا دخل ہے، یا ذہنی ہمخیالی اس شادی کا باعث ہوئی ہے؟"

جیل کے پھاٹک کے پاس پہنچتے پہنچتے میں نے کہا "محمد افضل ٹریڈ یونین لیڈر ہے اور میں ایک اخبار نویس ہوں، اس لئے افضل کے حالات کے بارے میں

میں آپ سے کچھ بتانے کے قابل نہیں ہوں اور پھر لوگوں کی بولیوں کے بارے میں میں بہت کم سوچتا ہوں۔ اس لئے اس معاملہ میں بالکل کورا ہوں"

اس فقرے سے وہ کچھ محظوظ ہوا اور اس کے پتلے سنجیدہ اور کرخت چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ، نمودار ہو گئی۔

زنجیریں اور تالے

جیل کا آہنی پھاٹک کھلا

پھاٹک بند ہو گیا۔ اب زندگی نظروں سے اوجھل تھی۔ اور زنجیروں اور تالوں کے کھلنے اور بند ہونے کی صدا آ رہی تھی۔

شعر، نغمہ اور موسیقی سب کچھ آہنی پھاٹک کے باہر تھا۔ اور لوہے کے بڑے بڑے وزنی تالے، لمبی مضبوط زنجیریں اور سلاخیں نظر کے سامنے تھیں۔ ڈیوڑھی میں دائیں ہاتھ کی طرف بغلی کمرے کے باہر "ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ" کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی داخل ہوا

سب سے پہلے ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا محمد افضل مجھے دکھائی دیا۔ محمد افضل بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور اس کی عینک کے موٹے شیشوں میں سے اس کی ذہین آنکھیں مجھے تجسس سے پُر نظر آئیں۔ ہم دونوں نے فوراً ہاتھ ملایا! افضل نے اپنے پرانے بے تکلف انداز سے بڑی بے فکری سے کہا "تسیں بھی آ گئے او

جناب ـــ بیٹھو ـــ" جب میں بیٹھنے کے لئے پیچھے مڑا تو ایک کرسی پر ظہیر کاشمیری اپنے لمبے سنہری بالوں سمیت بیٹھا نظر آیا۔ میرا خیال ہے ظہیر کاشمیری زندگی میں تیسری بار آج صبح پانچ بجے اٹھا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف دو دفعہ وہ پانچ بجے اٹھا ہوگا۔ اور دونوں بار پولیس نے جیل لے جانے کے لئے ہی اسے صبح اٹھایا ہوگا۔ ورنہ عام طور پر اتنے سویرے وہ کبھی نہ اٹھتا ہوگا۔ چنانچہ آج بھی اس کے چہرے پر نیند کی کمی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے غالباً بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی اور اس کے لمبے بال اس گھریلو اور دیہاتی عورت کی طرح پھولے ہوئے تھے جو دن بھر کام کاج میں مصروف رہنے کی وجہ سے سر کے بالوں کی طرف سے غافل رہی ہو۔ ویسے ظہیر کاشمیری اپنی ذاتی زندگی کے تقریباً سبھی مسائل سے غافل رہتا ہے۔ لیکن اس صبح کو تو وہ عجیب چیز معلوم ہو رہا تھا۔ بیڈن روڈ اور میکلوڈ روڈ پر نکلنے سے پہلے وہ ہمیشہ اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو ترتیب دے کر باہر نکلتا ہے۔ لیکن آج یار لوگوں نے اسے اصلی صورت میں موقعہ پر پکڑ لیا تھا اور وہ گڑبڑایا ہوا تھا۔

میں نے کہا "ظہیر کاشمیری! تم تو تین مہینے سے بیمار تھے؟"

"پولیس کو شاید اس کی اطلاع ابھی تک نہیں ہوئی تھی" اس نے فوراً جواب دیا۔

"او چھوڑ یار" افضل نے ہنستے ہوئے کہا "تم سمجھتے ہو کہ بیماری کی اطلاع مل جاتی تو تمہیں گرفتار نہ کیا جاتا؟"

اس پر کمرے کے آخری سرے سے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے شوکت منٹو بیٹھا ہوا نظر آیا۔

کافی دیر تک ہم چاروں اپنی اپنی گرفتاری اور جیل تک کے سفر کی بات چیت کرتے رہے۔ بار بار وہی بات ہوتی تھی۔ اور ایک ہی قسم کے فقرے بولے جاتے تھے مگر سب کے سب اپنے پیچھے رہ جانے والی دنیا کے بارے میں سوچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

یکایک دروازہ کھلا اور ایک درمیانہ قد اور پکے رنگ کا آدمی شلوار قمیص پہنے اندر داخل ہوا اور دفتر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہ سنٹرل جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چودھری احمد خاں تھے۔ انہوں نے گھور گھور کر ہم چاروں کی طرف دیکھا اور سی۔ آئی۔ ڈی کے افسروں سے جو وہاں موجود تھے، ہمارے وارنٹوں کی کاپیاں طلب کیں۔

ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے جو وہاں پہلے ہی سے موجود تھا کہا "ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ صبح چار بجے لایا گیا تھا اور اسٹور میں بند کر کے بٹھایا ہوا ہے"

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا "اس کو بھی یہاں لے آؤ۔"

پانچواں آدمی

ہم چاروں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ پانچواں آدمی کون ہے۔

یہ پانچواں آدمی چونکہ سب سے پہلے آ گیا تھا اور اسٹور میں جمع کر دیا گیا تھا اس لئے اس کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ یہ احمد ندیم قاسمی تھے۔ مگر اس وقت تک اس حقیقت سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔

دروازہ کھلا اور پانچواں آدمی اندر داخل ہوا۔ ندیم قاسمی اس وقت ایک اور ہی شخصیت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی شلوار، نیلی قمیص، بکھرے ہوئے بال اور ٹوٹا ہوا چپل دیکھ کر ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ندیم نے ہم چاروں کو باری باری دیکھا اور بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا "آپ لوگ تو بڑے بنے بنائے بیٹھے ہیں۔ کپڑے بھی تبدیل کئے ہوئے ہیں۔ مجھے تو بستر سے اٹھا لائے ہیں یار"

تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کہا "یار میرے ساتھ یہ ایسی بدسلوکی کیوں ہوئی واہ بھئی واہ! میں تو سمجھتا تھا کہ سب لوگ آج اسی طرح پکڑے جائیں گے مگر آپ تو بالکل تیار ہو کر آئے ہیں" ندیم نے افضل کی کلف لگی اور دھوبی کے ہاں سے دھلی ہوئی قمیص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا فقرہ دہرایا۔ ہم سب نے اپنی اپنی گرفتاری کا قصہ دہرایا۔

ندیم نے کہا "دیکھو جی میں نے کئی بار ان سے کہا، کپڑے تبدیل کر لینے دو مگر انہوں نے تو اتنے زور سے مجھے پکڑا کہ کپڑے تبدیل کرنا اور گھر میں کسی سے ملنا تک بھی ممکن نہ ہوا"

اتنے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے پکارنا شروع کیا:۔

"محمد افضل کون ہے؟"

محمد افضل کھڑا ہو گیا۔

"آپ کی بی کلاس ہے" اس نے کہا "آپ اِدھر آجائیے۔"

"پروفیسر شوکت منٹو کون ہے؟"

شوکت منٹو کھڑا ہو گیا۔

"آپ کی بی کلاس ہے۔ آپ اِدھر آجائیے"

"احمد ندیم قاسمی کون ہے؟"

"آپ کی سی کلاس ہے۔ آپ اِدھر آجائیے"

مارے حیرت کے ہماری چیخ نکل گئی۔ ارے یہ ہند و پاک کا عظیم المرتبت شاعر، افسانہ نگار، بارہ کتابوں کا مصنف، شہیدِ ادب، جس نے ۳۵ سال کی عمر میں اتنا لکھا ہے کہ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں اور چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی ہیں۔ یہ فن کا متوالا، پاکستان کے لوگوں کا محبوب فنکار کیا سی کلاس میں رہے گا؟

میں نے کہا "ندیم صاحب یہی کسر باقی رہ گئی تھی!"

افضل نے چلا کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا "او جی جناب ذرا چنگی طراں نال ویکھو کوئی غلطی تاں نئیں؟"

مگر غلطی یہاں نہیں تھی۔ غلطی تو بہت پیچھے تھی۔ یہاں تو ندیم کا وارنٹ تھا جس میں سی کلاس نظربند لکھا تھا۔

میری اور ظہیر کاشمیری کی بھی سی کلاس تھی۔ ظہیر کاشمیری نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "یارو ذرا غور تو کرو، انگریز کے زمانے میں میں دو دفعہ جیل میں گیا تو مجھے بی کلاس ملی۔ اب ابنائے وطن مجھے سی کلاس میں رکھ رہے ہیں میں تو اختلاج قلب کا مریض ہوں میں تو مر جاؤں گا۔"

میں نے کہا "فکر نہ کرو ظہیر کاشمیری! ہم اتنی آسانی سے مرنے والے نہیں ہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہمیں اپنے کمرے سے اٹھا کر سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لے گیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ناموں کی فہرست سے ہمارے نام اس طرح پکارے جیسے سکول میں بچوں کی حاضری لگتی ہے۔ حاضری لگا کر انہوں نے ہمیں رخصت کر دیا۔

جب ہم اس کے کمرے سے واپس ڈیوڑھی میں پہنچے تو چودھری احمد خاں نے گرجتے ہوئے شوکت منٹو سے کہا "پروفیسر صاحب پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ افسر کے سامنے پیش ہوتے وقت بھی سگریٹ منہ میں رکھتے ہو۔ جانتے نہیں ہو یہ جیل خانہ ہے"

شوکت منٹو چپ رہا۔ وہ ہمیشہ ہی چپ رہتا ہے۔

افضل نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "چودھری صاحب ہمیں کیا معلوم تھا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے سامنے سگریٹ نہیں پینا چاہیئے۔ یہ بتلانا تو آپ کا فرض ہے۔ ہمیں تو اتنا معلوم تھا کہ جیل میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے"

"اجازت ہے تو کیا افسروں کے سامنے بھی سگریٹ پینے کی اجازت ہو سکتی

ہے" چودھری صاحب نے غصے میں یہ فقرہ ادا کیا اور پاس کھڑے ہوئے ایک
اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے کہا "جاؤ ان سب لوگوں کو سیاست خانے میں لے جاؤ"
ہم یہ سوچتے ہوئے ڈیوڑھی کے اندرونی آہنی پھاٹک کے سامنے آ کھڑے
ہوئے کہ یہ سیاست خانہ کیا چیز ہے۔

سیاست خانہ

ہم سب ایک ایک کرکے ڈیوڑھی کے اندرونی آہنی پھاٹک کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے گذر کر جیل میں داخل ہوئے۔ کھڑکی بند ہوگئی۔ قیدی پھاٹک کے آس پاس باغیچہ میں کام کر رہے تھے۔ قیدیوں کے جسم پر چارخانہ والے وہ کپڑے تھے جو اس سے پہلے ہندوستانی فلموں ہی میں دیکھے تھے۔ ہماری نظروں کے سامنے ایک اجنبی اور انجانی دنیا تھی جس کے بارے میں ایک آدھ کو چھوڑ کر ہم میں سے کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا جس دنیا کے بارے میں ہم سب کچھ جانتے تھے وہ نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی۔ غائب ہوچکی تھی۔

پھاٹک کے بائیں ہاتھ جیل کی اونچی دیوار کے ساتھ ساتھ ہم اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ

کے پیچھے پیچھے سیاست خانہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یہ راستہ جیل روڈ کے بالکل متوازی تھا۔ جیل روڈ اور ہمارے درمیان یہ اونچی اور کھردری دیوار حائل تھی مگر باہر کی آوازیں اس دیوار کو عبور کر کے اندر آ رہی تھیں۔ سڑک پر چلنے والے تانگوں، موٹر اور بسوں کے ہارن اور چھابڑی بیچنے والوں کی آوازوں نے ہم سب کو اداس کر دیا۔ سب لوگ تھوڑی دیر تک خاموش چلتے رہے اور باہر سے آنے والی قسم قسم کی آوازوں کو سنتے رہے۔

محمد افضل اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ساتھ سب سے آگے چل رہا تھا اس کے پیچھے ندیم، ظہیر، شوکت منٹو اور میں قدم ملائے جا رہے تھے۔ یکایک باغیچہ میں کام کرنے والے ایک قیدی نے نظر اٹھا کر افضل کے چھ فٹ لمبے قد، اس کی عینک کے شیشوں اور کلف لگی قمیض کو غور سے دیکھ کر ہاتھ اوپر اٹھایا اور سلام کیا۔ افضل نے آنکھ بچا کر دائیں بائیں دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ قیدی کے سلام کرتے وقت اس کی طرف کسی نے نہیں دیکھا تو اس نے گردن کو ذرا سا جھکا کر اپنے ہاتھ کو چھاتی تک لیجاتے ہوئے قیدی کے سلام کا جواب دیا۔ مگر جب ہم سب کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو خفیف ہو کر خود بھی مسکرانے لگا۔ ابھی ہم سب اس واقعے سے پوری طرح محظوظ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک اور قیدی نے افضل کو سلام کیا۔ اور پھر تو سیاست خانہ تک کوئی درجن بھر سلام ہوئے، افضل بھی سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر سلام کا جواب دیتا اور پھر گھبرا کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگتا۔

ڈیوڑھی سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر جاکر نصف دائرے کی شکل میں ایک دیوار نظر آئی جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کوئی دس دروازے تھے، ہر دروازے پر ایک ایک تالہ پڑا ہوا تھا۔ ایک وارڈر چابیوں کا گچھا لئے ان دروازوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

ہم درمیان کے ایک دروازے کے سامنے جاکر رُک گئے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے اشارے پر وارڈر نے دروازے کا تالا کھولا اور ہم سب سیاست خانہ کے سات نمبر بلاک میں داخل ہو گئے۔

اس بلاک میں پچیس کوٹھریاں تھیں۔ ان میں سے صرف سات آٹھ سلامت تھیں، باقی گر چکی تھیں۔ ابھی ہم ان کوٹھریوں اور اپنی اس نئی اقامت گاہ کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ایک کوٹھڑی سے نیکر پہنے، عینک لگائے ساڑھے چار فٹ کا ایک لڑکا بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ یہ حسن عابدی تھا۔

حسن عابدی سے ہم سب شاید ایک ایک دو دو بار مل چکے تھے مگر ہم میں سے کسی نے بھی اسے فوراً نہیں پہچانا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور اس کے خشک ہونٹ اس طرح نظر آ رہے تھے گویا ابھی ابھی کسی نے ان پر لکڑی کے برادہ کا چھڑکاؤ کیا ہو۔ حسن عابدی کو ہم سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس نے جب یہ بتلایا کہ وہ ۲۱ اپریل کو گرفتار ہوا اور دو مئی تک شاہی قلعہ میں رہنے کے بعد یہاں لایا گیا تو ہم میں سے کسی نے بھی اس کے

ہونٹوں پر جمے ہوئے برادے کے متعلق کوئی استفسار نہیں کیا چند ہی منٹ میں عابدی کے چہرے پر تازگی آگئی۔ اس نے کہا "میں دو مہنی سے ان پچیس کوٹھڑیوں میں اکیلا ہوں۔ آج اس دنیا میں میں غالباً سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہوں کہ میرے اتنے سارے ساتھی یہاں آگئے ہیں۔ ہم سب نے اسے گھور کر دیکھا۔

حسن عابدی نے پیشہ ور راستہ دکھلانے والوں کی طرح ہمیں کوٹھڑیوں کی سیر کرائی اور بتایا کہ "جیل کی اصطلاح میں کوٹھڑی کو کوٹھی کہا جاتا ہے بعض لوگ کوٹھی کی بجائے اس کو چکی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ چند سال پہلے ہر کوٹھی میں ایک ایک چکی ہوتی تھی اور جیل کے مجرموں کو پندرہ سیر دانے پیسنے کی سزا دے کر چکی بند کیا جاتا تھا۔ اب چکی کی مشقت بند ہو چکی ہے مگر جیل میں قصور کرنے والوں کو ان کوٹھیوں میں بند کیا جاتا ہے، یہ جیل میں سخت ترین جگہ ہے ——"

"جیل میں قصور کرنے والوں کو یہاں پر بند کیا جاتا ہے —— مگر جیل میں قصور کرنے سے تمہاری مراد کیا ہے ——؟" محمد افضل نے حسن عابدی سے پوچھا۔

"مثلاً" اگر کوئی قیدی مشقت نہ کرے یا دنگا فساد کرے یا کسی افسر کی بے عزتی کرے تو اسے ان چکیوں میں بند کیا جاتا ہے" ظہیر کاشمیری نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "آپ لوگ سب نئے ہیں۔ میں ان چکیوں میں بہت بند رہ چکا ہوں"

ندیم نے چلا کر کہا "یارو ہم نے تو جیل سے باہر بھی کوئی قصور نہیں کیا۔ ہمارے وارنٹوں پر تو "احتیاطی نظر بندی" لکھا ہوا ہے۔ پھر ہمیں ایسی جگہ پر کیوں رکھا جا رہا ہے جہاں جیل کے قصور واروں کو رکھا جاتا ہے ۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا" ظہیر کاشمیری نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے بڑے پُر اسرار اور گھمبیر لہجہ میں کہا "مگر آہستہ آہستہ! تیزی مت کرو۔ ذرا حالات کا مطالعہ کر لیں، پھر غور کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے"

محمد افضل حیرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا گویا کہیں کھو یا گیا ہو۔ شوکت منٹو چپ چاپ اس طرح چل پھر رہا تھا جیسے اس کے سر پر کم از کم دو من بوجھ لدا ہوا ہے۔ مجھے بار بار اپنی بیمار بہن کا خیال آتا تھا۔

نمبردار اور بستر

ابھی ہم اس جگہ کے بارے میں سوچ بچار کر ہی رہے تھے کہ ایک نمبردار دو تین قیدیوں کے سر پر تپڑیوں، دریوں اور کمبلوں کا بوجھ اٹھوائے ہوئے باہر کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ حسن عابدی نے فوراً اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ اس نمبردار کا نام مکھن ہے اسے عمر قید کی سزا ہے۔ موصوف ایک قتل میں سات سال کی سزا حاصل کر کے رہا ہوئے تھے۔ رہا ہونے کے بعد واپس گھر جاتے ہوئے ایک جگہ رات بھر کے لئے قیام کیا اور دوسرا قتل کر کے بیس سال کے لئے پھر یہاں آ گئے۔

مکھن نمبردار نے سب کو ایک ایک تپڑی، ایک ایک دری جو ڈیڑھ فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی تھی، اور دو دو کمبل دے دیئے اور انکشاف کیا کہ یہ ہمارے بستر ہیں۔

ندیم نے کہا "مگر بستر میں تکیہ نہیں ہے"

نمبردار نے ہنستے ہوئے کہا "سی کلاس میں تکیہ نہیں ملتا لیکن شاید آپ کے گھر سے بستر آجائیں تو آپ کو تکیہ رکھنے کی اجازت مل جائے"

میرے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھتے ہوئے کہا "یار چائے کا بندوبست کب ہو گا؟"

"جب آپ رہا ہو جائیں گے" حسن عابدی نے جواب دیا۔

اس جواب کے بعد ہمارے چہروں پر سیاہی چھا گئی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"تو کیا چائے جیل میں نہیں ملے گی؟" ندیم نے حیرت سے منہ کھول کر چیختے ہوئے کہا۔

"جی نہیں!" حسن عابدی نے کہا "میں نے آٹھ دن سے چائے نہیں پی۔ چائے کے لئے ترس گیا ہوں"

ندیم نے پریشانی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے کہا "یار و ہم لوگ دن میں پانچ سات بار چائے پیتے تھے، کوٹ پتلون پہنتے تھے، گھر میں سلیقے کا فرنیچر بھی رکھتے تھے مگر حکومت نے ہمیں سی کلاس میں رکھ کر بتلا دیا کہ ہماری حیثیت کچھ نہیں ہے ہم

سب پڑھے لکھے لوگ ہیں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ڈرامہ" میں نے ندیم کے کان میں آہستہ سے کہا۔

ظہیر کاشمیری نے کہا "فکر نہ کرو ہم عرضیاں لکھیں گے کہ ہمیں بی کلاس ملنی چاہیے میں عرضی لکھوں گا کہ" انصاف اور جمہوریت کے نام پر میں حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ مجھے میری حیثیت کے مطابق کلاس دی جائے۔ میں اپیل کروں گا کہ میں گریجویٹ ہوں، معروف شاعر ہوں، مختلف رسالوں کا ایڈیٹر ہوں، مجھے کلاس دو۔ میں اپیل کروں گا۔"......

" ارے چھوڑو یار ——— یہ سب اپیلیں کس کے سامنے کرو گے؟" افضل نے کہا۔

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے پیپل کے درخت کے گھنے سائے میں کمبل بچھالیا اور اس پر بیٹھ گئے۔ پھر وہی گرفتاری کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ہم سب نے اپنی اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سامنے رکھ دیئے اور بے تحاشا سگریٹ پینے لگے۔

احاطہ کا دروازہ باہر سے بند تھا اور باہر تالا لگا ہوا تھا۔ یکایک تالا کھلا، ایک منشی رجسٹر ہاتھ میں لئے داخل ہوا اور قلم دوات سنبھالتے ہوئے بولا "سب لوگ اپنا اپنا نام لکھواؤ بھئی!"

"محمد افضل!" افضل بلند آواز سے بولا۔

"محمد افضل ولد؟" منشی نے کہا۔

"اچھا تو یہ بھی ہو گا!" شوکت منٹو نے کہا۔

اس کے بعد منشی نے سب کے نام اور ولدیت رجسٹر میں درج کئے اور باہر چلا گیا۔ باہر کا تالا پھر بند ہو گیا۔

دیواریں ہی دیواریں

ہم سب کمبل پر ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے، زندگی کی اس نئی اور اجنبی منزل پر رفاقت کا مضبوط احساس اب بیدار ہو رہا تھا گویا ہم سب ایک ہی ہیں اس سنگلاخ منزل پر پہنچ کر سارے دوست، جو اپنی خواہشیں محبتیں اور حسرتیں اس اونچی بھوری دیوار کے باہر چھوڑ آئے تھے، ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے گویا ہم صدیوں سے اکٹھے ہیں، ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ جیل میں آکر آج پہلی بار مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ باہر سے جیل کا جو تصور ذہن میں تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ اس ایک جیل میں کئی جیلیں ہیں۔ ایک اونچی دیوار ہمیں باہر کی عظیم، حسین، حرکت کرتی ہوئی زندگی سے جدا کر رہی ہے تو ایک دوسری دیوار ہمیں جیل کے اندر کی زندگی سے بھی جدا کر رہی ہے۔ اس احاطے کی دیوار نے ہمیں جیل کے قیدیوں سے بھی علیحدہ کر دیا تھا۔ زندگی دیواروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

جیل یا سسرال

کچھ دیر ہم سب اسی طرح کچھ سوچتے، کچھ پریشان بیٹھے اپنی نئی زندگی، پرانی دنیا اور نئی پابندیوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ ہر آدمی کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کا پتہ ملتا تھا مگر صاف صاف کچھ کہنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔—— اسی اثنا میں باہر کا پھاٹک کھلا اور دادا فیروزالدین منصور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے اور مسکراتے ہوئے احاطے میں داخل ہوئے۔ دادا اس شانِ بے نیازی سے جیل میں داخل ہو رہے تھے کہ ہم سب کو سخت حیرت ہو رہی تھی۔ دادا کی شیو تازہ بنی ہوئی تھی، ہاتھ میں ان کا محبوب قینچی کا سگریٹ اور چہرے پر ان کی معصوم مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح بکھری ہوئی تھی پیچھے دو قیدی ان کا ٹرنک اور بستر بندا اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ ہم سب بھاگ کر دروازہ کی طرف لپکے، مگر دادا کی چال میں کوئی تیزی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح چہل قدمی کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

"دادا معلوم ہوتا ہے آپ جیل میں نہیں بلکہ سسرال آئے ہیں" ندیم نے سب سے پہلے دادا سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"دادا یہ جیل خانہ ہے" افضل نے آگے بڑھ کر کہا "مگر آپ کو دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابھی ابھی گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہل رہے ہیں"

"ہاں ہاں یہ جیل خانہ ہے، مجھے ابھی احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بتایا تھا۔"

شوکت منٹو نے ایسی آواز میں کہا جس کو سننا اور سمجھنا کافی مشکل کام تھا۔

دادا نے ٹرنک کھولتے ہوئے اپنا جملہ سامان، کپڑے، تیل، صابن، سگریٹ، ماچس اور ضروریات کی تمام چیزیں میدان میں رکھ دیں اور کہا "تم لوگ ناتجربہ کار ہو، میں نے اپنی سات مرتبہ جیل یاترا کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا ہے" پھر بستر کھولتے ہوئے کہا "دیکھ لو یہ بستر بھی مکمل ہے"

اس مکمل بستر میں تکیہ، دری، کھیس اور چادر کے ساتھ ساتھ لحاف بھی رکھا ہوا تھا مئی کی اس خوفناک گرمی میں لحاف دیکھ کر پبلک حیران ہوئی بلکہ کسی نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ "دادا ستمبر اکتوبر کے آنے والے سرد موسم کے پیش نظر لحاف بھی لے آئے ہیں"

دادا منصور نے منجھے ہوئے فنکارانہ انداز میں کہا "بھائیو سردیاں بھی یہاں گزارنا پڑ سکتی ہیں، ہمیں کسی سرد مقام پر بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کو اپنا تمام سامان مکمل رکھنا چاہیئے۔ کون جانے کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔

یہ مفصل جواب سن کر کسی کو اور کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

دادا منصور کے آنے کے بعد ایک بار پھر ہر ایک نے اپنے اپنے گرفتار ہونے کی تفصیل سنائی۔ یہ قصے دسیوں بار دہرائے جا چکے تھے مگر چار دیواری میں محبوس ہونے کے بعد موضوع ہی کتنے رہ جاتے ہیں جن کا ذکر ہو سکتا ہے چنانچہ ہر ایک اپنے صبح سویرے

کے واقعات دہرا رہا تھا۔ واد انے کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرز سے لے کر گوالمنڈی تھانے تک جانے، وہاں پر بیٹھنے، چائے پینے اور شیو بنانے تک کے تمام قصے سنائے تو ندیم قاسمی نے ایک بار پھر رقت بھری آواز میں کہا "یار وہ مجھے گرفتار کرنے پر کون کم بخت مامور ہوا تھا، اس نے مجھے کپڑے تبدیل کرنے دینا تو ایک طرف رہا، گھر میں کسی سے ملنے تک بھی نہ دیا۔ میں نے بہت کہا مگر اس نے تو مجھے بازو سے اس طرح پکڑ لیا تھا کہ چھوڑ دے گا تو بھاگ جاؤں گا"

واد انے بتایا کہ صبح کمیونسٹ ہیڈ کوارٹرز سے ان کے علاوہ غلام محمد کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ شمیم اشرف ملک اور لال خاں کی تلاش جاری ہے۔ اور یہ بھی اطلاع دی کہ پولیس والے غلام محمد کو شاہی قلعہ میں لے گئے ہیں۔

شاہی قلعہ کا ذکر سن کر حسن عابدی نے کہا "ارے باپ رے باپ وہاں تو بڑی مار پڑتی ہے۔ غلام محمد بے چارہ تو پھنس گیا۔"

ایک اور

کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد احاطہ کا پھاٹک کھلا اور چیف وارڈر اندر آ کر شکستہ اور سالم کوٹھڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اس پھاٹک سے باہر جھانک کر جیل ہی میں پھرنے والے ان انسانوں کو دیکھنے کی کوشش کی جنہیں ہم سے الگ کرنے کے لئے جیل میں اس احاطہ کی صورت میں ایک اور جیل تعمیر کر دی گئی

تھی۔ سامنے قیدی مشقت کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے، بعض کان پر ہاتھ رکھ کر تانیں لگاتے ہوئے نظر آئے۔ مجھے یہ سارا مجمع یہ سارا منظر بڑا عجیب لگا چارخانہ گاڑھے کے کرتے پاجامے پہنے یہ قیدی اتنی تعداد میں تھے اور یہ سب اپنے ارد گرد کی دنیا سے اس قدر بے خبر، اس قدر مصروف، مطمئن اور خوش نظر آتے تھے کہ میرا جی چاہا بھاگ کر ان میں مل جاؤں۔ جنہیں سماج مجرم کہہ کر اس چاردیواری میں بند کر دیتی ہے ان کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی، کون جانے ان میں کتنے بڑے بڑے دماغ ہوں جنہیں غلط سماجی تربیت، غلط ماحول، تعلیم کی کمی اور جہالت نے یہاں لا ڈالا۔ وہ کیا سوچتے ہیں، کیسے دن گزارتے ہیں، یہ سب کچھ جاننے کے لئے میں اس وقت بیقرار ہو اٹھا تھا لیکن اپنے ہی جیسے ان قیدیوں سے ملنے کی بھی ہمیں اجازت نہیں تھی۔ ہمارے لئے اس احاطے کی چاردیواری سے باہر قدم رکھنا بہت بڑا جرم تھا۔ اس لئے میں خاموشی سے پلٹنے لگا۔

پلٹتے ہوئے میں نے ذرا سے فاصلہ پر غلام محمد کو کھڑے دیکھا۔ غلام محمد جو خاموش مگر محنتی کارکن ہے جس کی محنت نے پچھلے تین سال میں بہت سے مرحلوں پر اس سے بڑے بڑے کام لئے تھے، جو دوسروں کا کام کرنے سے بھی کبھی ہچکچاتا نہیں تھا لٹھے کی شلوار اور گبرون کی قمیص میں ملبوس کھڑا غور سے احاطے میں کمبل بچھا کر زمین پر بیٹھے ہوئے ان درویشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سخت اور سنجیدہ چہرے کو ایک ہی بار دیکھنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ سخت کرب میں مبتلا ہے اور اس

پریشانی سے دوچار ہے کہ اگر اسے یہاں اپنے ساتھیوں میں جگہ نہ ملی تو وہ جیل کے کسی دوسرے حصہ میں اکیلا بند کر دیا جائے گا۔

خوش قسمتی سے ہماری کوٹھڑیوں میں ایک اور سالم کوٹھڑی نکل آئی اور چیف وارڈر نے غلام محمد کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

غلام محمد نے بھی دادا کی معیت میں اپنا بستر بمعہ لحاف کے ساتھ لے لیا تھا۔

انسانوں کی خوراک

دس بجتے بجتے کھانے کا شور ہوا۔ ہم میں سے سوائے دادا اور غلام محمد کے کسی نے بھی صبح چائے نہیں پی تھی اور پھر صبح دس بجے کھانے کا خیال تک بھی نہ آسکتا تھا۔ اس لئے کھانے کو کسی کا بھی جی نہیں چاہتا تھا مگر جب نمبردار اور حسن عابدی نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ فیصلہ کر دیا کہ کھانا کھانا ہے تو ابھی کھایا جا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا نہ تو مل سکے گا اور نہ اس قابل ہو گا کہ کھایا جا سکے، تو سب تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ نمبردار نے ڈنر سیٹ یعنی ایلومونیم کا ایک ایک پیالہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور ہماری گنتی کر کے دو روٹی فی کس کے حساب سے ہر ایک آدمی کو اس کا حصہ دے دیا۔ روٹیاں میدان میں کمبل پر اوپر نیچے رکھ دی گئیں۔ ابھی ہم ان روٹیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک عجیب و غریب سیاہ مائع ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس سیاہ اور خوفناک سیال شے میں سے جلے ہوئے

تیل کی بُو نے اتنی تیزی سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ ہمیں اپنی ناکیں غائب ہوتی معلوم ہوئیں۔ یہ بدبودار سیاہ چیز ماش کی دال تھی۔ یہ انکشاف حسن عابدی نے اپنے ہفتہ بھر کے تجربے کی روشنی میں کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ دال کی رنگت لوہے کی دیگ استعمال کرنے سے بدل گئی ہے ورنہ کوئی خاص بات نہیں۔ حسن عابدی ہفتہ بھر میں اس دال کا عادی ہو چکا تھا مگر اس کے اس انکشاف پر ہم سب نے متفقہ طور پر ایک چیخ ماری۔ دال کا پیالہ ندیم کے ہاتھ میں تھا، پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ع "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" پیالہ ان کے ہاتھ سے لے کر میں نے کہا "چلئے میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے آتا ہوں" دادا نے ایک بار پھر ڈھارس بندھائی "کسی نہ کسی طرح گزارہ کرو چند دن بعد کھانا پکانے کی اجازت مل جائے گی"

ظہیر کاشمیری نے شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی اور کہا "آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے اطمینان سے لقمہ توڑا اور دال میں ڈبو کر کھانے لگا۔

"کھا گیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں کھا گیا!" ظہیر نے اسی خشوع و خضوع کے ساتھ دوسرا لقمہ توڑتے ہوئے جواب دیا۔

ہم سب ابھی تک اپنی اپنی روٹی ہاتھ میں لئے بے بسی کی تصویر بنے سیاہ دال پہ

نظریں جمائے بیٹھے تھے، اس چیز کو جو ہمارے سامنے رکھی تھی کھانے کا حوصلہ کسی میں بھی نہ تھا۔ اگرچہ سب کے سب ہنس ہنس کر باتیں بنا رہے تھے لیکن دل ہی دل میں یہ کھاجا مستقل طور پر کھانے کے تصور ہی سے لرزہ طاری تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہم پڑھے لکھے لوگوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاسی قیدیوں کو اس قسم کا کھانا دیا جائے گا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کی جیل کی زندگی کے تذکرے پڑھنے کے بعد کچھ اس قسم کا احساس دل میں موجود تھا کہ جیل میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ عام مجرموں سے بہتر سلوک کیا جاتا ہے لیکن میں یہ بھول رہا تھا کہ ہم نے اس طبقے کے ساتھ اپنا تعلق قائم کیا ہے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے طبقوں سے الگ ہے، وہ محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کا طبقہ ہے جو محنت کرتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں —— اس لئے ہمیں بھی ہماری پارٹی اور قومی جماعت نے ان تمام مراعات سے محروم کر دیا تھا جو اونچے طبقے کے لوگوں اور ان کے نمائندوں کو ملتی ہیں۔ پھر بھی حیرت اس بات میں تھی کہ بڑے بڑے چور، ڈاکو اور مجرم گریجویٹ ہونے کی صورت میں اخلاقی جرم میں ماخوذ ہو کر آنے کے بعد بی کلاس میں رکھے جاتے تھے، ہم میں سے ندیم، ظہیر اور منصور نہ صرف گریجویٹ تھے بلکہ اپنے اپنے حلقہ میں بہت بڑی پوزیشن کے مالک تھے۔ ندیم درجن بھر کتابوں کا مصنف، منصور ماسکو یونیورسٹی کا گریجویٹ اور مشہور کسان لیڈر، ظہیر مشہور شاعر، مگر یہاں سب ایک ہی صف میں بیٹھے تھے، صف بھی کیا تھی کمبل پر بیٹھے تنور کی

ادھ پکی روٹیاں اور ماش کی سیاہ دال سامنے رکھے اپنی اپنی تقدیر پر غور کر رہے تھے۔

ندیم نے یکایک گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک لقمہ دال سے چھوا کر برق رفتاری سے منہ میں ڈال لیا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ناک کو پکڑتے ہوئے کہا "ناک کو پکڑ لیا جائے تو کھانا بُرا نہیں"

سب نے دو دو چار چار لقمے کھا کر چھوڑ دیئے، روٹیاں اور دال اسی طرح پڑی تھی یکھن نمبردار محض مسکراتا رہا، اس نے اپنی گھنی مونچھوں سے سیاہ ہونٹ پھیلاتے ہوئے کہا "شروع میں سب ایسا ہی کرتے ہیں مگر کچھ دن گزر جانے پر عادت ہو جاتی ہے۔ دو چار روز میں تم لوگ دو دو روٹیاں کھا کر اور بھی مانگو گے"

اتنے میں بی کلاس والے دونوں آدمیوں افضل اور شوکت منٹو کے لئے لوہے کی چار پائیاں اور ایک تھال میں لگا ہوا کھانا آگیا۔ توے کی پکی ہوئی روٹیاں اور گوشت دیکھ کر پوری قوم نے اجتماعی حملہ کر دیا اور دو منٹ کے اندر اندر انکا کھانا صاف کر دیا گیا۔

پابندیاں ہی پابندیاں

کوئی گیارہ بجے نمبردار چابیوں کا گچھا لے کر آ گیا اور آتے ہی اس نے اعلان بھی کر دیا کہ "سب لوگ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں چلو گنتی بند ہو گی"

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جیل کے قاعدے کے مطابق قیدی صبح گنتی کرنے کے بعد کھولے جاتے ہیں، دوپہر کو انہیں گننے کے لئے پھر بارکوں اور کوٹھڑیوں میں اپنی اپنی جگہ پہ بند کیا جاتا ہے دو بجے کے بعد انہیں کھول کر پھر کام کاج پہ لگایا جاتا ہے اور سرِ شام پھر ان کی تعداد معلوم کی جاتی ہے یعنی انہیں رات بھر کے لئے بند کر دیا جاتا ہے۔ جیل میں قاعدے کے مطابق کسی قیدی کی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ ہر قیدی ایک عدد ہے، ایک اکائی ہے۔ صبح، شام، دوپہر ان کو ان کے اپنے حصے میں گن کر ڈیوڑھی میں قیدیوں کی جو تعداد درج ہے اس کے ساتھ ملا لیا جاتا ہے۔ اگر کم ہو جائے تو معلوم کیا جاتا ہے کہ کمی کہاں پر ہے، اور کون بھاگ گیا۔

ہم نے لاکھ سر مارا کہ ہم جتنے بھی ہیں سامنے بیٹھے ہیں، دوسرے قیدیوں کی طرح ہم مشقت کے لئے جیل کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک بھی نہیں جاتے کیونکہ ہمیں تو احاطے سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند کر کے گننے کی بجائے ہمیں اسی طرح احاطہ ہی میں گن لیا جائے کیونکہ ہم تو احاطہ میں بند ہی ہیں تو پھر الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کرنے سے کیا حاصل ہو گا مگر بقول چودھری احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یہ جیل خانہ تھا، اس لئے ہماری کوئی بات نہ سُنی گئی اور ہماری گنتی بند ہو گئی یعنی ہم سب الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند تھے۔

پہلی تنہائی

کوٹھڑیوں کا جنگلہ دار دروازہ بند تھا۔ باہر بڑا موٹا سا تالا تھا۔ مجبوری کے اس پہلے احساس نے ساتھیوں سے علیحدہ ہونے پر مجھے اور بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ صبح سے ہم آپس میں بات چیت کرتے، قہقہے لگاتے اور لطیفہ بازی کرتے رہے تھے۔ اس مصروفیت میں کسی کو اپنے متعلق کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں اس آفت کا احساس ضرور تھا مگر واضح طور پر کچھ سوچنے اور غور کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ کوٹھڑی میں تنہا اور سب سے علیحدہ ہونے کے بعد جیسے صبح سے اب تک زندگی میں جو انقلاب آیا، وہ واضح اور صاف شکل میں سامنے آگیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تین بجے کھولا جائے گا۔ یہ تین گھنٹے تین صدی سے بھی زیادہ لمبے نظر آرہے تھے۔ کوئی کتاب نہ تھی، کوئی مصروفیت نہ تھی اور وقت گزارنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ کوٹھڑی میں لیٹتے ہی لمحہ بھر میں اپنا چھوٹا سا گھر، اپنی بیمار بہن اور پیچھے رہ جانے والے دوستوں کے چہرے نظروں کے سامنے آ گئے اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں پگھلا جا رہا ہوں۔ پاس کچھ بھی نہ تھا۔ زندگی کی ساری ضروریات ختم ہو چکی تھیں۔ وہ ہنگامے، وہ مصروفیتیں، جن سے انسانی زندگی عبارت تھی، جن سے صبح شام فرصت نہ ملتی تھی سب ختم ہو چکے تھے اب ایک نئی منزل، ایک نیا سفر سامنے تھا جس کے آغاز و انجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

بوریہ بستر

میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو مونج کی ایک چٹائی، ڈیڑھ فٹ چوڑی ایک دری اور دو کمبل نظر کے سامنے تھے، یہی اس کوٹھڑی کی کُل کائنات تھی۔ ایک کونے میں قبر کی طرح ایک کھڈی تھی اور دوسرے کونے میں مٹی کا ایک برتن رفع حاجت وغیرہ کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر مجھے معاً یہ احساس ہوا کہ باہر کی دنیا کی تبدیلیوں کا اس چاردیواری کے اندر تک کوئی اثر نہیں پہنچتا۔ یہ وہی کوٹھڑی، وہی کھڈی اور وہی برتن ہے جس کا ہر جیل جانے والے سیاسی کارکن نے ذکر کیا ہے۔ مجھے مولانا عبدالمجید سالک کی سرگذشت کے وہ حصے یاد آئے جو چند دن پہلے چھپے تھے اور جن میں انہوں نے پچیس سال پہلے کی جیل یاترا کے سلسلے میں کھڈی اور اس لازوال برتن کا ذکر کیا تھا۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ وہی نقشہ، وہی کوٹھڑیاں، وہی مونج کی چٹائی اور دری ——— اتنے برس گذرنے پر، اتنی تبدیلیاں، انقلاب اور تغیر رونما ہونے کے باوجود یہاں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

چٹائی پھیلا کر اس پر دری بچھاتے ہوئے میں لیٹ گیا مگر اس نام نہاد بستر میں تکیہ نہیں تھا۔ کسی کے پاس بھی تکیہ نہیں تھا مگر مجھے بار بار ندیم کا خیال آتا تھا جو میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں بغیر تکیہ کے لیٹا ہوا تھا۔ جس نے اپنی جوانی، اپنی عمر کا بہترین حصہ، اپنا گھر اور سب کچھ فن کی نذر کر دیا تھا۔ اس حقیقت سے کسے انکار

ہو سکتا ہے کہ اس نسل کے ادیبوں میں بہت کم ندیم کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اس لیے کہ جتنی محنت اس نے کی ہے اتنی محنت وہی ادیب کر سکتے ہیں جن کے اندر تخلیق کی صلاحیت، قوت اور جذبہ ہوتا ہے جو اپنے فن اور مقصد میں مخلص ہوتے ہیں ندیم اس پوزیشن میں تھا کہ وہ اپنی قیمت کا اعلان کر دیتا لیکن ایک سچے اور عظیم فنکار کی طرح اس نے آرام اور اطمینان کی زندگی کو چھوڑ کر مصیبتوں کا خار دار راستہ منتخب کیا۔ اس نے اسی راستے پر قدم بڑھائے جس کی طرف جانے کے لئے اس کے ضمیر نے کہا۔ اس کا دل بھی ایک خوبصورت گھر، ذاتی آرام اور آسائش کے حصول کے لئے للچاتا ہوگا مگر اس نے اپنی ذات کو کائنات پر قربان کر دیا۔ یہی چھوٹے اور بڑے، جھوٹے اور سچے فنکار کا فرق ہے اور اسی سچائی اور صداقت کے لئے آج وہ زمین پر لیٹا تھا۔ اور وہ جو قلم کی ایک جنبش سے اچھے خاصے انسانوں کو بغیر ان کا جرم بتائے کال کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں اپنے گھروں میں آرام سے لیٹے ہیں۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ آج فن پابہ زنجیر ہو گیا ہے، شاعر حسن و عشق کے نغمے گاتا ہوا اور انسانی بلندیوں اور عظمتوں کا راگ الاپتا ہوا لوہے کے منحوس کٹہرے میں بند ہو گیا ہے اور انسانی روح کے معمار زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ بار بار میں سوچتا کہ ندیم اگر پندرہ سال تک پکوڑے بیچنے اور بنانے کا کام اختیار کر لیتا تو اس وقت کم از کم بغیر تکیہ کے یوں زمین پر نہ لیٹا ہوتا۔ ندیم کے بعد دادا منصور تھا جس نے انگریز کے زمانے میں درجنوں بار جیل کاٹی اور شاہی قیدی

کی حیثیت سے رہا۔ اس وقت جب وہ اپنی عمر اور زندگی کی آخری منزلوں میں ہے، جب بڑھاپا اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے، وہ پاکستان کی اس آزاد مملکت ہی میں سی کلاس میں زمین پر لیٹا ہوا دمہ اور کھانسی سے ہانپ رہا ہے۔

یہ کیسی تبدیلی ہے؟ یہ کیسی آزادی ہے؟ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ تیسری کوٹھری میں سے ظہیر کاشمیری نے چلا کر ڈرامائی انداز میں کہا " توفیق کس حال میں ہے؟"

"شبیر لوہے کے جال میں ہے!" میں نے چلا کر جواب دیا۔

یہ فقرے صبح سے ہماری زبان پر تھے۔ کسی تھیٹریکل ڈرامہ کے یہ ڈائیلاگ ہمارے اس قدر حسب حال تھے کہ ہم نے انہیں اپنے منشور کے طور پر اپنا لیا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں ہر کوٹھڑی سے "توفیق کس حال میں ہے" اور "شبیر لوہے کے جال میں ہے" کی صدائیں سنائی دینے لگیں مگر یہ ایک بخار تھا جو اندر سے اٹھا اور چند ہی لمحوں میں سرد ہو گیا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ مہیب، خوفناک خاموشی طاری ہو گئی جس نے روح کو کچل کر رکھ دیا۔ میری اور غالباً سب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے جلد ملا دیا جائے، ہمیں الگ الگ بند نہ کیا جائے۔ ہم سب ایک ہی کوٹھڑی کے بلیک ہول میں بند ہونے کو تیار تھے مگر یہ تین گھنٹہ کی علیحدگی مارے دے رہی تھی۔ اب ہمیں باہر رہ جانے والے دوستوں سے جدائی کا اتنا غم نہیں تھا جتنا آپس میں بٹ جانے کا تھا ——

تھوڑے سے وقفے کی خاموشی کے بعد ہم سب زمین پر لیٹے لیٹے ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے۔ چیخنے چلّانے اور گانے لگے، اور تو اور دادا منصور بھی گانا گا رہا تھا۔ جب گاتے گاتے تھک گئے تو گالیاں بکنے لگے۔ اس ماحول اور اس پابندی میں آ کر جیسے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

آملے سینہ چاکان ......

تین بجے ایک ایک کر کے سب کوٹھڑیوں کے تالے کھول دئے گئے۔ ہم سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں سے نکل کر ایک دوسرے سے گلے ملے۔ اس طرح ملاقات ہوئی گویا برسوں کے بچھڑے ہوئے مل رہے ہیں۔ احاطہ میں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت تھا اس کے نیچے کمبل بچھا کر ہم پھر اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی سی دیر کے بعد احاطہ کا تالا کھلا پھر دروازہ کھولا گیا۔ ڈیوڑھی کا ایک نمبردار دو مشقتیوں کے سر پر کچھ سامان اٹھوائے اندر داخل ہوا۔ معلوم ہوا گھر والے ہمیں سامان ضروریات کی چیزیں اور بستر وغیرہ بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ میرے اور ندیم کے گھر والوں نے پہل کی تھی اور ہمارا سامان ڈیوڑھی سے ہو کر پہنچ گیا تھا۔ سامان میں ہمارے بستر، کچھ کپڑے، صابن، ٹوتھ پیسٹ، سگریٹ وغیرہ وصول کر کے ہم سب نے باقاعدہ ناچ کیا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہم دونوں کے بستروں میں تکیے

نہیں تھے۔ میرے بستر میں رات کو باندھنے کی دھوتی بھی نہ تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تکیہ سی کلاس میں رکھنے کی اجازت نہیں اور میرے گھر سے جو دھوتی آئی تھی وہ ریشمی تھی لیکن سی کلاس میں بند ہونے کی وجہ سے ہم ریشمی دھوتی بھی نہیں رکھ سکتے اس لئے تکیے اور دھوتی واپس کر دئے گئے۔

"میں تو ہمیشہ دو تکیے رکھتا تھا" ندیم نے روکھی آواز میں کہا۔

"چارپائی پر لیٹتے وقت تو میں بھی دو تکیے رکھتا۔ لیکن زمین پر تو تین چار تکیوں کی ضرورت ہے" میں نے اسی دردناک لہجے میں کہا لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا۔

ندیم نے تھوڑی دیر کے بعد چلا کر کہا "تکیے کے بغیر میں تو سو ہی نہیں سکتا"

"کمبل کے تکیے بنا لو یار" حسن عابدی نے تجربہ کارانہ انداز سے کہا۔

سب لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کا اظہار کیا۔

شام تک ہم لوگ اسی طرح کمبلوں پر بیٹھے جملہ بازی اور لطیفہ گوئی کرتے رہے جتنی بھی داستانیں اور قصے یاد تھے ہم نے ایک دوسرے کو سُنا ڈالے، اسی طرح چائے کا وقت آگیا۔ صبح سے کسی نے چائے نہ پی تھی، چار بجے کے قریب افضل اور شوکت منٹو کے لئے چائے ایک گڑوی میں بھر کر لائی گئی تو ہماری باچھیں کھل گئیں۔ سب کے سب اپنے ایلومینیم کے پیالے لے کر میدان میں اتر آئے،

مگر دو آدمیوں کی چائے سے آٹھ آدمیوں کا کیا بنتا؟ دو دو گھونٹ پی کر ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔

ساڑھے چار بجے پھر کھانے کا شور ہوا۔ تنور کی ادھ پکی دو دو روٹیاں اور ماش کی سیاہ دال اور سیاہ سبزی پھر ہمارے سامنے تھی۔ سرسوں کے تیل کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا مگر قوم نے کچھ نہ کچھ کھا لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ پیٹ کا دوزخ بھرے بغیر تو گذارہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی ہم نے ایک ایک نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ مکھن نمبردار نے اپنے کرتے کے نیچے سے دس بارہ تازہ پیاز نکال کر میدان میں رکھ دئے۔ وہ کہیں باغیچہ سے چرا لایا تھا۔ پیاز کو دیکھ کر زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی معشوق سے مل کر بھی اس قدر فرحت اور سکون محسوس نہیں ہوتا جس قدر جیل میں ایک پیاز حاصل کر کے ہوتا ہے چنانچہ ہم نے ایک ایک پیاز ہاتھ میں لے لیا۔ ایک لقمہ منہ میں ڈال کر تیل کی سڑاند کم کرنے کے لئے تھوڑا سا پیاز کاٹ کھاتے۔ پیاز کی بو تیل کی بو پر غالب آجاتی۔ ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ احاطہ کے باہر کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ اس آواز سے مکھن نمبردار کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے جلدی سے تمام پیاز اپنے کرتے کے نیچے چھپا لئے اور سرگوشی کے انداز میں کہا "ڈپٹی صاحب آ رہے ہیں"

آنے والے ہمارے انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پال صاحب تھے۔ پال صاحب کا چہرہ سیاہ مگر دانت سفید تھے جو ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر

باتیں کرتے جاتے اور ہمارے کھانے کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے جاتے تھے۔

آتے ہی انہوں نے کہا "کسی چیز کی ضرورت کوئی تکلیف؟"

ہم نے انہیں اس بیہودہ کھانے کی طرف توجہ دلائی۔

جواب ملا "آپ لوگوں کو حکومت نے سی کلاس میں رکھا ہے اور سی کلاس میں تو یہی کھانا ملتا ہے"

ہم نے بستروں میں تکیوں کا مطالبہ کیا۔

جواب ملا "سی کلاس میں تکیہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے ——"

ہم نے دوپہر کو الگ الگ بند کئے جانے پر احتجاج کیا۔

جواب ملا "کیا کریں جیل کا قاعدہ ہی یہ ہے۔ ہم تو صرف اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ آپ یہاں سے بھاگ نہ سکیں ورنہ آپ کی کلاس، آپ کو رکھے جانے کے طریقہ کا فیصلہ اور دوسری تمام چیزوں کے بارے میں پولیس ہی فیصلہ کر سکتی ہے۔ آپ ہمارے نہیں پولیس کے قیدی ہیں"

پال صاحب یہ مژدۂ جانفزا سنانے کے بعد ہنستے اور قینچی کے سگریٹ پیتے ہوئے باہر چلے گئے۔ مکھن نمبردار نے بعد میں ہمیں بتایا کہ اگر ڈپٹی صاحب کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے ہمیں پیاز لا کر دیا ہے تو اس کی نمبرداری ختم ہو جاتی اور سزا کے طور پر اسے مشقت دے کر چکی میں بند کر دیا جاتا۔

پھر وہی کنجِ قفس

کھانے کے فوراً بعد ساڑھے چار بجے نمبردار پھر چابیوں کا گچھا لے کر آیا تو ہمارے چہروں پر مردنی طاری ہو گئی۔ یہ شام چمکیلی اور زندہ شام، گرم آگ برساتی ہوئی شام اور ہمیں لوہے کے جنگلوں اور مٹی کی سیلی در و دیواروں میں رات بھر کے لئے بند کیا جا رہا ہے؛ شام تو آتی ہے مجلس منعقد کرنے کے لئے، دوستوں سے گپ لگانے، گھومنے اور آوارہ پھرنے کے لئے، شام آتی ہے کہ ہم دن بھر کے کام کے بعد اپنے پیاروں، اپنے محبوبوں اور چاہنے والوں سے ملیں۔ کچھ اپنی کچھ دنیا کی باتیں کریں۔ دل کے فسانے دہرائیں، کسی باغ میں ایک روش کے قریب پھولوں کے تختوں پر سے ہوتے ہوئے سرگوشیوں میں اپنے محبوبوں سے دل کے راز کہیں اور دنیا میں بہار کا دور دورہ ہو جائے اور کلیاں چٹک جائیں اور پھول کھلنے لگیں۔ لیکن یہ کیسی شام ہے۔ یہ کیسا بھیانک مقام ہے کہ ہم آپس میں بھی ایکدوسرے کے پاس بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ یہ کیسے بے رحم لوگ ہیں، یہ کیسے ظالم قانون ہیں جن کی تشنگی ہمیں اپنے پیاروں، اپنے محبوبوں، اپنے عزیزوں اور اپنے دوستوں سے علٰحدہ کر کے بھی ختم نہیں ہوئی ——————

ہمیں ایک ایک کر کے اپنی اپنی کوٹھڑی میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا۔ پہلے افضل بند ہوا اور اپنی بی کلاس کی لوہے کی چارپائی پر دراز ہو گیا۔

کھٹ کھٹ! جنگلہ بند ہو گیا۔ تالہ لگ گیا۔

پھر شوکت منٹو اپنی بی کلاس کی لوہے کی چارپائی پر دراز ہوا۔

پھر ندیم اپنی سی کلاس کی زمین پر لیٹ گیا۔ کھٹ کھٹ ہوئی، تالہ بند ہو گیا میرا دل ڈوب گیا۔ اس کے بعد ظہیر، منصور، غلام محمد، حسن عابدی اور ہیں سب کے سب "تالہ بند کر دیئے گئے۔ ہم سب زمین پر چٹائیاں بچھا کر لیٹ گئے۔

دادا منصور نے کوٹھڑی میں داخل ہونے کے بعد زمین پر لیٹتے ہوئے کہا "جس انجینئر نے یہ کوٹھڑیاں تعمیر کی تھیں اسے اس کی اس محنت پر انعام دیا گیا کہ اس کی کوششوں سے ان کوٹھڑیوں میں ہوا کا داخلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا"۔

"تاریخی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ کوٹھڑیاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے گھوڑوں کے لئے تعمیر ہوئی تھیں"، محمد افضل نے آخری کوٹھڑی میں سے چیخ کر کہا۔

ندیم نے اپنی کوٹھڑی میں سے بآواز بلند بڑھاوا دیا "اور تاریخی طور پر آپ یہ دیکھ لیں گے کہ چھ مہینے ان کوٹھڑیوں میں بند رہنے کے بعد ہم سب لوگ گھوڑے بن جائیں گے"

"یاد رکھئے صبح سویرے ناشتے کے لئے چنے بھی ملتے ہیں"، حسن عابدی نے آواز بلند کی۔

غلام محمد نے کہا "تو بھئی پھر گھوڑے بننے میں کیا شک باقی رہ گیا ہے"

اس تھوڑی سی گفتگو کے بعد پھر خاموشی ہو گئی، سناٹا چھا گیا۔ سب چپ تھے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ پوری جیل میں لوہے کی منحوس آواز گونج رہی تھی۔ کوٹھریاں اور بارکیں بند ہو رہی تھیں۔ تالے لگ رہے تھے۔ رنگ و آہن کی دیواریں ایک انسان کو دوسرے انسان سے، ایک قیدی کو دوسرے قیدی سے، ایک دوست کو دوسرے دوست سے الگ کر رہی تھیں۔ اور انسان اور قیدی شور کر رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے۔ ان کی آوازیں ہمارے احاطے کی پندرہ فٹ اونچی بلند دیواروں کو پھاند کر ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم نے بھی چیخنا چلانا اور گالیاں بکنا شروع کر دیا۔ کیونکہ سب کے سب اس گہرے سناٹے سے ڈر رہے تھے جو اس شور و غل کے باوجود ہر طرف حکمران تھا۔ وہ سناٹا، وہ پُر اسرار خوفناک سناٹا جو ہر کوٹھڑی کے آگے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اس سناٹے اور دہشت اور کھا جانے والی خاموشی اور تنہائی سے بچنے کے لئے سب چیخ رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔ کوٹھڑیوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی میری کوٹھڑی کے چاروں کونوں سے ایک عجیب سی بھنبھناہٹ کی آواز آنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ مدھم آواز ایک گونج میں تبدیل ہو گئی۔ یہ مچھروں کی آواز تھی جو لاکھوں کی تعداد میں ہر کوٹھڑی میں موجود تھے۔ کوٹھڑی میں لوہے کے دروازہ کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا اور مٹی کی

اس تپتی ہوئی سیاہ اور سنگین رات میں ہم سب کے سب مچھروں کے رحم وکرم پر تھے۔ کسی نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ کیونکہ یہ منزل ایسی تھی جہاں مدافعت کسی کام نہیں آتی۔

ببیں تفاوتِ راہ

باہر احاطے میں آسمان کی کھلی چھت کے نیچے چار نمبردار تین تین گھنٹے کے لئے رات بھر پہرہ دینے کے لئے آگئے تھے۔ انہوں نے اپنے بستر جمادیئے۔ یہ چاروں نمبردار عمر قید کاٹ رہے تھے۔ چاروں قاتل یا ڈاکو تھے مگر یہ قاتل اور ڈاکو ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ اور کھلے آسمان کے نیچے تازہ ہوائیں لیتے ہوئے تھے اور ادیب اور شاعر اور فنکار، انسانی روح کے معمار کال کوٹھڑیوں میں مقید تھے۔ کوٹھڑیاں جن میں ہوا اور روشنی کا گزر ہی نہیں ہو سکتا تھا، جہاں سناٹا اور خاموشی اور بھیانک تاریکی تھی۔

میں رات گئے تک جاگتا رہا۔ مچھروں کی کثرت اور گرمی کی شدت نے نیند کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ ساتھ کی کوٹھڑی سے منصور کے کھانسنے اور بلغم تھوکنے کی آواز مسلسل آتی رہی۔ دادا منصور کھانستے کھانستے جب بیدم ہو جاتا تو اس کی سانس چھاتی میں دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔ اس کی اور میری کوٹھڑی میں یہ آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔

پھر رات گزر گئی مگر نیند نہ آئی، سخت کھُردری اور بے رحم زمین تھی اور اندھیرا تھا۔ خاموشی اور سناٹا اور پہریداروں کی کبھی کبھی آنے والی پُراسرار خوفناک چیخیں سنتے سنتے دس گیارہ اور پھر بارہ بجے مگر میری آنکھ نہ لگی، روشنی نہیں تھی، کوئی کتاب بھی نہیں تھی کہ پڑھ سکوں اس لئے چپ چاپ لیٹنے اور اپنی نئی انوکھی اور پُراسرار زندگی پر غور کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔

یکایک بہت دور سے ایک تیز اور ہیبت ناک چیخ سنائی دی۔ یہ آواز کافی فاصلے سے آ رہی تھی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے۔ بس ایک درد بھری لے تھی۔ اگر وہ ہنس بھی رہی تھی تب بھی اس میں درد و کرب کی جھلک نمایاں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا یہ آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گذر رہی ہے۔ میں نے اس سے بچنے، اس کا دھیان نہ کرنے کی لاکھ کوشش کی مگر آواز مسلسل آ رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر میں نے پہرے والے نمبردار کو آواز دے کر پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ عورتوں کے پاگل خانہ سے کسی پاگل عورت کی آواز آ رہی ہے۔ اور یہ آواز ہمیشہ آتی رہے گی۔

بارہ بجے تک یہ کیفیت رہی کہ ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگتی گھنٹہ بجنے کی آواز سے آنکھ کھل جاتی۔ دل میں یہ امید پیدا ہوتی کہ صبح ہونے والی ہے شاید چار بج گئے ہیں۔ ممکن ہے پانچ ہی بجے ہوں، مگر گھنٹہ بجتا رہتا۔ چار تک

گنتی اس امید پہ ہوتی کہ صبح ہونے والی ہے مگر پھر پانچ چھ سات حتی کہ گیارہ اور بارہ بجنے کی آواز سے مایوسی ہوتی کیونکہ معلوم ہوتا کہ بارہ ہی بجے ہیں۔

امیدوں کے چراغ

صبح تین بجے تک تقریباً سب لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیند جو گرمی اور مچھروں کے حملوں پر غلبہ پا چکی تھی اپنا تھوڑا سا حق وصول کر کے پھر غائب ہو گئی تھی تین بجے ہی سے ہمارے ذہنوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گی، ہم اپنی اپنی کوٹھڑیوں سے نکل کر ایک دوسرے سے ملیں گے، ہنسیں گے، بات چیت کریں گے اور یہ بے رحم تنہائی اور سناٹا ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ مگر صبح ہونے اور ملنے میں ابھی بہت دیر تھی، ابھی رات بڑی احتیاط سے قدم بڑھا رہی تھی، ابھی تو صبح کاذب کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ دور کہیں سے کوئی آواز آتی تو یوں معلوم ہوتا گویا فرشتے صبح کے آنے کا اعلان کر رہے ہیں مگر یہ صبح پھولوں اور نغموں کی صبح نہ ہو گی بمبئی کی اس چمکیلی صبح کو آسمان نظر کے سامنے نہ ہو گا لیکن پھر بھی ہم سب کو ایک ہی انتظار تھا کہ کب صبح ہو اور کب ہم لوگ باہر نکالے جائیں۔

صبح چھ بجے کے بعد جب ہماری کوٹھڑیوں کے تالے کھلے تو ہم ایک دوسرے سے یوں ملے گویا صدیوں کے بچھڑے ہوئے مل رہے ہیں تیرہ گھنٹے

کال کوٹھڑیوں میں گزارنے کے بعد صبح کو باہر نکلنے وقت چہل قدمی کرنے کا خیال سب سے پہلے ظہیر کاشمیری کے دل میں پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ احاطے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کے اوپر کے حصے کو آگے کی طرف جھکا کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے جسم کا اوپر کا حصہ چھجے کی طرح سامنے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ دیوار کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ اس طرح تیزی سے واپس مڑتا گویا کوئی چیز بھول آیا ہو۔ ہم سب لوگ تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے، اس کے بعد کمبل بچھا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں نمبردار نے کوئی آدھ سیر بھنے ہوئے چنے ہمارے سامنے لا کر رکھ دیئے اور ہم نے ناشتہ شروع کر دیا۔

"دو چھ مہینے تک یہ ناشتہ کرتے رہنے کے بعد ہم لوگ رہا ہونے سے پہلے ہی ہنہنانا شروع کر دیں گے" ندیم نے کہا۔

ظہیر کاشمیری رات بھر جاگتے، پیٹ میں درد رہنے اور پیچش اور بدہضمی کی شکایت کرنے میں مصروف تھا۔ چنے آنے سے پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ آدھی رات کے وقت اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا گویا کوئی اس کا سر علیحدہ کرکے لئے جا رہا ہے اور آدھی رات کے بعد اس کا دل ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر چنے ملنے پر اس نے کوئی بات کئے بغیر ہاتھ اور منہ چلانا شروع کر دیا، اس دوران میں اس نے صرف اتنا کہا "چنے تو بڑے لذیذ ہیں"

"مگر دوستو! چائے کے بغیر انتقال ہو جائے گا" یہ ندیم قاسمی کی آواز تھی

چائے کی یاد سے اس سہانی صبح کو سب کے چہروں پر اداسی چھا گئی۔ سگریٹ ابھی تک موجود تھے مگر سگریٹ کے ساتھ صبح کو حاضری پر چائے کی غیر حاضری سب کو کھل رہی تھی۔ ہم نے جیل کے افسروں کو بہت دفعہ کہلا بھیجا کہ چائے کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ چائے آج کی زندگی میں ضرورت بن چکی ہے مگر ۱۸۵۷ء کے بنے ہوئے قوانین کے مطابق سی کلاس کے قیدیوں کو چائے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ہم سب سی کلاس کے نظربند تھے اس لئے پوری قوم سگریٹ کے کش لگا کر حسرت بھری نظروں سے بیت الخلاء کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنی دیر میں ایک نمبردار چائے کی گڑوی لے کر دروازہ میں نمودار ہوا اور پورے زور سے بولا "چلو بھئی بی کلاسیو چائے لو اپنی چائے"

چائے افضل اور شوکت منٹو کی تھی مگر ہم سب اپنے اپنے پیالے لے کر گڑوی کے گرد بیٹھ گئے اور للچائی ہوئی نظروں سے گڑوی کی طرف دیکھتے رہے۔ افضل نے سب کے پیالوں میں دو دو گھونٹ چائے کے ڈال دیئے — ابھی پیالہ میرے ہونٹوں تک پہنچا ہی تھا کہ ناظم نے اپنے پیالے کو دادا منصور کے پیالے میں الٹتے ہوئے کہا "دادا کو اس ضعیفی میں چائے کی ہم سے زیادہ ضرورت ہے ——— اور پھر وہ عادی بھی تو بہت تھے"

چائے کے دو گھونٹوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی مگر سب نے کسی اور بیچارگی

کہ اس وقت میں اس چھوٹی سی قربانی نے منصور کے چہرے پر ایسا رنگ بھر دیا کہ خوشی اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی مگر اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ ندیم نے اس کو چائے کے نہیں آبِ حیات کے گھونٹ پلا دئیے ہیں۔ کتنی معمولی بات تھی۔ عام زندگی میں شاید ہم ایسی حرکت کبھی نہ کر سکیں لیکن اس ایک لمحہ میں منصور کے بیمار مردہ چہرے پر خون کی جھلک نمایاں ہو گئی۔ سب نے اپنے اپنے پیالوں سے تھوڑی تھوڑی چائے منصور کے پیالے میں اُلٹ دی اور سب اس چھوٹی سی قربانی پر مسرور اور مطمئن نظر آتے تھے۔ ایسے موقعے زندگی میں اکثر آتے ہیں جب ہم دوستوں کی خوشیوں پر اپنی خوشی قربان کر کے مغموم نہیں بلکہ مسرور ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی خوشی تھی۔

قانون ہی قانون

شام تک ہمیں جیل کے بے شمار قوانین معلوم ہوتے رہے مگر قوانین کے بارے میں مختلف بلکہ متضاد رائیں تھیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی قانون خواہ کتاب میں موجود ہی ہے اس کے لئے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کی منظوری ضروری ہے اور یہ منظوری اور اس کی درخواست اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ خود ہفتہ وار راؤنڈ پر آئیں گے۔ اس راؤنڈ کو جیل کی اصطلاح میں

پریڈ کہا جاتا ہے۔ بہرحال ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایک قانون کے مطابق ہم اپنا کھانا خود پکا سکتے ہیں۔ جیل والے ہمیں آٹا، نمک، مرچ، تیل، ایندھن وغیرہ دے دیں گے، گھی ہم گھر سے منگوا سکتے ہیں۔ چائے کا سامان بھی گھر سے منگوا سکتے ہیں اور اجازت ملنے پر اپنا کچن شروع کر سکتے ہیں لیکن اجازت منگل کے روز سپرنٹنڈنٹ صاحب کی پریڈ پر ان سے درخواست کرنے پر مل سکے گی۔ اس کے بعد ملاقات ہونے پر ضرورت کی چیزیں گھر سے منگوا سکتے ہیں اس کے علاوہ باہر کی دنیا سے ہمارا کوئی رشتہ نہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملاقات سی۔ آئی۔ ڈی کے افسروں کی موجودگی میں ہوگی۔ خط لکھیں تو وہ خط پہلے جیل والے پڑھ کر پاس کریں گے پھر ان کو سی آئی ڈی کے دفتر میں سنسر ہونے کے لئے بھیجا جائیگا۔ وہاں سے وہ سنسر کر کے ان کو پھر جیل میں بھیجیں گے، پھر کہیں یہ خطوط پوسٹ کئے جائیں گے اور اس طرح کم از کم دس بارہ روز لگیں گے۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب منگل کو اس علاقے کا دورہ کرتے تھے جس میں ہم سب مقید تھے، جمعرات کے روز ملاقاتیں ہوں گی تب جا کر شاید کھانے اور چائے کے مسائل حل ہوں۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم یہ چھ دن بغیر چائے اور بغیر اچھے کھانے کے کیسے گذاریں گے۔ اس امید پہ کہ شاید کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہو ہم نے کئی بار جیل رولز کی کتاب منگوانے کی کوشش کی مگر جیل کے افسر ہمیں رولز دینے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ رولز مانگنے پر

یہ جواب ملتا کہ سی کلاس کے قیدی کھانا خود پکا ہی نہیں سکتے۔ پرانے نمبردار جو نوکری یا پہرہ دینے آتے ہیں، بتاتے کہ کھانا پکانے کی اجازت مل جائے گی اور یہ بھی کہ سیاسی قیدی عام طور پر کھانا خود پکاتے ہیں یا کلاس ملنے کی صورت میں مشقتی سے پکواتے ہیں۔

ہم نے ایک میٹنگ منعقد کر کے یہاں تک طے کر لیا کہ افضل اور منٹو کو مشقتی مل جائیں گے وہ ان کا کھانا تو پکائیں گے ہی، ہمارا کھانا بھی ساتھ ساتھ پک جایا کرے گا۔ یہ بڑے اطمینان کی بات تھی مگر ہمیں دانائے راز یہ بھی بتا دیتے تھے کہ ہفتہ دس دن ہمیں تنگ کیا جائے گا تاکہ ہم پر جیل والوں کا رعب پڑ جائے اور ہماری طبیعت صاف ہو جائے۔ اس کے بعد ہمیں اس طرح اجازت دی جائے گی گویا ہم پر خاص طور سے کرم کیا جا رہا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جیل کے افسر ہر بات کے بارے میں قانون کا حوالہ دے دیتے مگر تھوڑی دیر کے بعد قانون کو چھوڑ کر بات مان لیتے — دراصل جیل میں کوئی قانون ہی معلوم نہیں ہوتا تھا جو جس افسر کی مرضی ہوتی وہ قانون بن جاتا اور ان سب افسروں کے اوپر جو سپرنٹنڈنٹ کی مرضی ہوتی وہ بڑا قانون تھا۔

محرومی

دوپہر تک ہمارے پاس سگریٹ بالکل ختم ہو گئے۔ اصل میں ہم پریشانی اور

گھبراہٹ میں بے تحاشا سگریٹ پیتے رہے تھے۔ اس محرومی اور بے چارگی کے اندھیارے میں صرف سگریٹ ہی تو ایک رفیق تھا جس کی مشعل جلا کر ہم اپنے غم بھول جاتے تھے مگر فلک کج رفتار کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ تین بجے بعد دوپہر جب ہمیں تین تین گھنٹے کی قید تنہائی سے نجات ملی اور ہم سب باہر نکلے تو سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

محمد افضل نے بڑے اداس لہجے میں کہا "نکوٹین کی کمی کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا ہے دوستو!"

اس کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ یہ اٹل حقیقت تھی۔ یہ آخری اور واحد خوشی بھی چھن گئی تھی اور دنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ مگر آدھ گھنٹے کے بعد افضل اور شوکت منٹو کے گھر سے سامان آ گیا۔ اس سامان میں سگریٹ بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ پھر مجلس منعقد ہوئی، کمبل بچھ گیا۔ یار لوگ پھر سگریٹ پھونکنے اور جس قدر لطیفے یاد تھے، ایک دوسرے کو سنانے میں منہمک ہو گئے۔ مگر سب ایک مبہم خطرے کے احساس سے پریشان تھے ایک نمبردار نے بتا دیا تھا کہ افضل اور شوکت منٹو شاید ہمارے ساتھ نہ رہنے پائیں گے کیونکہ بی کلاس کے قیدیوں کے لئے الگ جگہ بنی ہوئی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ ہم میں سے کسی ایک کا الگ ہو جانا قیامت سے کم نہ تھا۔ اور اگر یہ بلا نازل ہو جائے تو ہم

کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔

دن اسی طرح گزرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب صبح شام آتے۔ ایک مشقتی سر پہ سوڈا واٹر کی بوتلیں رکھنے والے ڈبے کی قسم کا ایک بڑا سا ڈبہ اٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ اس چھ کھٹے میں چھ کے قریب بوتلیں ہوتی تھیں۔ ان بوتلوں پر نمبر انیس، نمبر پچیس اور نمبر اٹھائیس وغیرہ لکھا ہوتا۔ قیدی کہتے "ڈاکٹر صاحب پیٹ میں گڑبڑ رہتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب پکارتے "نمبر اٹھائیس پلاؤ"

مشقتی اٹھائیس نمبر کی خوراک دے دیتا۔

قیدی کہتے "ڈاکٹر صاحب کمر میں درد ہے"

ڈاکٹر صاحب پکارتے "نمبر اٹھائیس پی لو"

یہاں ہر مرض کا علاج نمبر پچیس اور نمبر اٹھائیس اور نمبر انیس سے ہوتا تھا

دن گزرنے لگے۔ دادا منصور کے دمہ میں اضافہ ہو گیا۔ ظہیر کاشمیری راتوں کو چلاتا رہتا اور چیختا "میرا سر اڑ گیا۔ ارے کوئی میرا سر لئے جا رہا ہے میرا دل ڈوب رہا ہے"

ظہیر نیوراستھینیا کا پرانا مریض تھا۔

جی ہاں مچھر تو بہت ہیں

تیسرے یا چوتھے روز ہمیں پانچ بجے کے قریب حسب معمول کوٹھڑیوں

میں بند کر دیا گیا۔ ہم سب خاموش لیٹے آنے والی زندگی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اتنے میں نمبردار نے پکار کر سب کو ہشیار کر دیا "ڈپٹی صاحب آ رہے ہیں"

ڈپٹی صاحب ایک ایک کمرے میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ہمارے رہن سہن کے طریقوں سے وہ کافی مطمئن اور مسرور ہوئے ہیں چودھری احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ڈیوڑھی کی پہلی ملاقات کے بعد آج ہی نظر آئے تھے۔

میری کوٹھڑی کے سامنے رک کر انہوں نے پوچھا "ٹھیک ہو؟"

"جی ضرورت سے زیادہ!" میں نے جواب دیا۔

وہ بغیر مسکرائے پلٹ کر جانے لگے تو میں نے کہا "ایک گزارش کر سکتا ہوں؟"

ان کے سیاہ اور سخت چہرے پر کچھ خفگی اور ناپسندیدگی کے آثار نظر آنے لگے مگر میں نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمیں رات کو باہر احاطے میں سونے کی اجازت مل جائے۔ ہم ان اونچی دیواروں اور پہریدار نمبرداروں کی موجودگی میں بھاگ تو سکتے نہیں۔ پھر احاطہ سے باہر نکل بھی جائیں تو جیل میں اور بہت بڑی بڑی دیواریں ہیں ——"

"سی کلاس کے قیدیوں کو باہر سونے کی اجازت نہیں ہے" یہ مختصر

جواب دے کر وہ رخصت ہو گئے۔

ندیم کی کوٹھڑی کے سامنے رُک کر انہوں نے کہا "آپ مولینا غلام مرشد کے بھائی ہیں؟"

"جی ہاں!" ندیم کی آواز آئی۔

"آپ کے ایک بھائی جیل کے محکمہ میں ہیں۔ وہ میرے ساتھ کام کر چکے ہیں"

ندیم نے ذرا حوصلہ سے جواب دیا "جی ہاں میرے بھائی جیل کے محکمہ میں بھی ہیں"

"اوہو آپ تو ہمارے اپنے آدمی ہیں، کوئی تکلیف ہو تو بتائیے"

ندیم نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا "اور تو سب ٹھیک ہے مگر مچھر بہت ہیں۔ رات کو سونا تقریباً ناممکن ہے"

"جی ہاں مچھر تو بہت ہیں" یہ کہہ کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ احاطہ سے باہر نکل گئے۔

آخر کار پریڈ کا دن آ گیا۔

پریڈ کے روز سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورے سے پہلے میڈیکل آفیسر آیا۔ میڈیکل آفیسر شکل صورت سے ہیڈ کلرک معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مشقتی دوائیوں کا چھکڑا اور دوسرا کرسی اٹھائے چل رہا تھا۔

جونہی وہ کرسی پر بیٹھا ظہیر کاشمیری نے آگے بڑھ کر کہا "ڈاکٹر صاحب میں نیوراستھینیا کا مریض ہوں، رات کو کبھی میرا سر غائب ہو جاتا ہے تو کبھی میرا دل ڈوبتا ہے۔ اس کا کچھ علاج ہونا چاہیئے ورنہ میں........"

میڈیکل افسر نے بڑی بے نیازی سے کہا "تمہارا علاج تو ہو رہا ہے نمبر پچیس کی ایک خوراک پی لو"

ظہیر کاشمیری ایک قدم آگے بڑھ کر بولا "ڈاکٹر صاحب! میں پانچ سال تک مریض رہنے کے بعد خود ڈاکٹر بن چکا ہوں۔ مجھے آپ نمبر پچیس کے چکر میں نہیں ڈال سکتے۔ نہ ہی آپ میرا علاج ایکوا پیورا سے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے میں میڈیکل فارما کوپیا سے واقف ہوں۔ یہ مت سمجھیئے کہ ہم لوگ یٹوپیا میں رہتے آئے ہیں"

تھوڑی دیر کے لیئے تو ڈاکٹر بھی چکرا گیا۔ اس نے گویا کہ پیچھا چھڑانے کے انداز میں کہا "اچھا اچھا میں آپ کی بیماری کے بارے میں غور کرونگا"

مگر ظہیر کاشمیری پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا "مگر مکمل تشخیص کے بارے میں آپ کو مجھ سے اس بیماری کی مکمل تاریخ جاننی پڑے گی"

"آدھ پاؤنڈ دودھ ظہیر کاشمیری کو آج سے دینا شروع کر دیجئے" ڈاکٹر نے بھاگتے ہوئے اپنے منشی کو کہا اور احاطے سے باہر نکل گیا۔

ظہیر کاشمیری نے فاتحانہ انداز سے کہا "تم لوگ سر رہنے ہو۔ میں جیل میں رہتا جانتا ہوں۔ اب ہم اس دودھ کا دہی جمایا کریں گے۔ ارے او نمبر دار کوئی مٹی کا پیالہ، کوئی ٹوٹا ہوا لوٹا یا کوئی اور برتن کہیں سے لادو جس میں دہی جمایا جا سکے"

باادب باملاحظہ ہوشیار

میڈیکل آفیسر کے جانے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورہ پر آنے کا درمیانی وقفہ جیل کے اس حصے میں قیامت سے کم نہ تھا۔ نمبردار، سپاہی، جمعدار، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چکر پر چکر لگا رہے تھے اور ہوشیار رہنے کی تاکید کر رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ کو، اسسٹنٹ جمعدار کو، جمعدار سپاہی کو، سپاہی نمبردار کو اور نمبردار قیدیوں کو ادب اور باملاحظہ رہنے کی تاکید کرتا تھا۔ چنانچہ ہمارا نمبردار چابیوں کا گچھا لے کر آ گیا اور ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند ہونے کو کہنے لگا۔

ہم بھی سویرے بغیر پروگرام کے بند ہونے کو تیار نہ تھے مگر نمبردار نے بتایا کہ "صاحب کے دورہ کے وقت سب کو بند کر دیا جاتا ہے"

"کیوں؟" ہم نے چیخ کر پوچھا۔

نمبردار نے سمجھایا "اس لئے کہ کوئی قیدی صاحب کی بے عزتی نہ کر دے"

اس کے منہ پر جوتا نہ مار دے یا کوئی اور شرارت نہ کرے"

ہم نے لاکھ سر مارا کہ ہم پڑھے لکھے آدمی ہیں، ہم ادیب، شاعر اور رنگیں نوا فنکار ہیں مگر وہاں تو ایک ہی جواب تھا — قانون اور سی کلاس!

ہمیں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ کوٹھڑی میں بند ہو کر اپنے اپنے بستر زمین پر بچھا دو، اپنے اپنے پیالے بستر پر سلیقہ سے رکھ دو کیونکہ پریڈ کا مطلب ہے صفائی دیکھنا، بستر اور برتن دیکھنا اور قیدیوں کو اگر کوئی سوال (درخواست) کرنا ہو تو وہ کہنا —

ہمیں کوئی پونے آٹھ بجے اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ باہر تالے لگ گئے۔ کوٹھڑی میں تنہا بند ہونے کے بعد میں پھر شدید ذہنی کوفت، اذیت اور اداسی کا شکار ہو رہا تھا۔ میں ہی نہیں سبھی اداس، پریشان اور خاموش تھے۔ سب اس بے عزتی کو محسوس کر رہے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ بقول ڈپٹی احمد خاں یہ جیل خانہ تھا اور بقول نمبردار مکھن کے یہاں سب برابر ہو جاتے ہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا تھا "یہاں بڑے بڑے آ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں، اس لئے ضد کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا"

۹½ بجے تک ہم لوگ اسی طرح بند رہے۔ ساڑھے نو بجے نمبردار میری کوٹھڑی کے سامنے آ کر بولا "صاحب آنے ہی والا ہے۔ اپنے جوتے اتار کر میرے حوالے کر دو۔ صاحب کے سامنے ننگے پاؤں کھڑے ہونا پڑتا ہے"

یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا "تم نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے؟"

"قیدی" اس کا جواب مختصر مگر جامع تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا "اگر آپ ضد کریں گے تو میری پیشی ہو جائے گی اور میں نمبرداری سے توڑ کر مشقت پر لگا دیا جاؤں گا"

میں نے کہا "کچھ بھی ہو میں جوتے اتارنے کے لئے تیار نہیں ہوں"

دس بجے معلوم ہوا کہ صاحب بہادر نے دورہ کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ ہمیں سوا دو گھنٹے بند رکھ کر کھول دیا گیا۔ باہر آنے پر یہ معلوم کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ جوتے نہ اتارنے کے سلسلے میں ہم سب میں حیرت انگیز یک جہتی پیدا ہو گئی تھی اور سب نے جوتے اتارنے سے فرداً فرداً انکار کر دیا تھا۔

باہر آنے پر ہم نے نمبردار سے پوچھا کہ ہمیں تو صاحب سے بہت سی باتوں کی اجازت لینا تھی۔ کھانا پکانے، چائے کا سامان منگوانے اور دوسری بہت سی باتوں کے بارے میں پوچھنے کے لئے ہم تو منگل کی پریڈ کا انتظار کرتے رہے تھے۔ اب کیا ہو گا؟

"اب اگلے منگل کو سہی" نمبردار نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ "جیل میں تو کام اسی طرح ہوتا ہے"

ایک ہفتہ مزید جیل کا کھانا کھانے اور چائے نہ ملنے کا خیال ہی سوہان روح تھا مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہئیے۔

یہ منگل کا دن بڑی مصیبت سے گزرا۔ صبح پریڈ نہ ہونے اور کھانا پکانے کے پروگرام کے سلسلے میں مایوسی ہونے کی وجہ سے کچھ کم کوفت نہ ہوئی تھی کہ دوپہر کے بعد ہمارا سگریٹوں کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا۔ سب کے چہروں پر بیزاری کے آثار نظر آرہے تھے۔ شروع میں تو ہم نے اپنے پھینکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے جمع کر کے پی ڈالے۔ لیکن یہ ٹکڑے بھی ختم ہوگئے۔ سگریٹ کی شمع کے بجھتے ہی جیسے زندگی کی جوت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس دن نہ تو جملے ہوئے، نہ ہی کسی نے کوئی لطیفہ سنایا۔ سب کے سب چپ چاپ منہ لٹکائے بیٹھے تھے اور ہر ایک کے چہرے پر 'دنیا فانی ہے' لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ مصروفیت اور کام کوئی نہ تھا' کتاب بھی کوئی نہ تھی جس سے دل بہلاوا کیا جا سکتا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد حسن عابدی نے بتایا کہ اسے جیل کی لائبریری سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ایک کتاب بطور خاص حاصل کر کے دی تھی تاکہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ ہم نے وہ کتاب فوراً منگوائی۔ یہ امام غزالی کے فلسفہ اور اقوال کا مجموعہ تھا۔ چنانچہ ہم سب نے اس کتاب کو بار بار پڑھنا اور اپنی اصلاح کرنا شروع کر دی۔

ندیم سرخیاں پڑھ رہے تھے۔ ایک سرخی تھی " دوشیزہ کسے کہتے ہیں؟"
" آہا ہا کیا کہا؟ دوشیزہ پھر کہنا" ظہیر کاشمیری نے کہا۔
اس لفظ کو دس بارہ بار دہرائیے" یہ افضل کی آواز تھی۔

کافی دیر تک ہم سب اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ کہا گیا تھا کہ زمین پہ سونا بڑے ثواب کا کام ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان کو قبر کا عذاب یاد رہتا ہے۔ دن بھر ہم قبر کا عذاب یاد کرتے اور اس سے ڈرتے رہے ــــ لیکن سگریٹ کی طلب پوری نہ ہوئی۔

امام صاحب نے لونڈیاں رکھنے اور " امرد پرستی کس حد تک جائز ہے" کے عنوان کے تحت کافی تفصیلی بحث کی تھی۔ ہم نے یہ بحث بھی ختم کر ڈالی اور اس کے بعد پھر سناٹا ہو گیا۔

" یار، نکوٹین کی کمی کی وجہ سے میرا جسم ٹوٹ رہا ہے" محمد افضل نے اپنا مشہور جملہ دہرایا۔

اس عظیم صداقت کے اظہار پہ سب نے محمد افضل کو جی بھر کے داد دی مگر سوال یہ تھا کہ سگریٹ کس طرح فراہم کئے جائیں۔ یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارے جیسے نظربندوں کی ملاقات ایک سی آئی ڈی افسر کی موجودگی میں ہر تیسری جمعرات کو ہو سکتی ہے لیکن جمعرات میں ابھی دو دن باقی تھے۔ یہ دو دن کیسے گزریں گے؟

میری پہلی بے ایمانی

شام کو پہرہ دینے والے نمبردار آئے تو انہوں نے ہماری نحوست بھری صورتوں سے صورت حال کا جائزہ لے لیا۔ چار نمبرداروں میں سے ایک نے مجھے ایک طرف لیجا کر چپکے سے تارمارکہ سگریٹ کا پیکٹ دیدیا۔ پیکٹ ہاتھ میں لیکر میں خوشی سے ناچتا ہوا شکریہ کے الفاظ ڈھونڈھ رہا تھا لیکن الفاظ شکر و امتنان کے سیلاب میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

اس نمبردار نے میری حالت کو سمجھتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں — کوئی بات نہیں۔ یہاں مل جل کر ہی وقت کٹتا ہے"

میں نے ایک ایک سگریٹ سب ساتھیوں کو دے دیا۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ —— کمینگی اور بے ایمانی سے کام لیتے ہوئے میں نے ایک زائد سگریٹ چھپا لیا۔ محرومی نے اس شام ہم سب کو ایک دوسرے سے اور اس زندگی سے بیزار کر دیا تھا اور ہم ایک دوسرے سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈھ رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ سگریٹ اگر ایک ہی سائز کے نہ ہوتے تو ہم میں چھوٹے بڑے سگریٹوں کی تقسیم پہ جھگڑا ہوتا۔ بہرحال اپنا اپنا سگریٹ لے کر ہم نے اجتماعی طور پہ یہ فیصلہ کیا کہ یہ سگریٹ کھانا کھانے کے بعد پئے جائیں گے۔

شام ہوئی، کھانا وہی تیل میں پکی ہوئی بدبودار دال اور تنور کی ادھ پکی روٹیاں زہر مار کرنے کے بعد تار کے سگریٹ سلگا لئے گئے۔ پہلے ہی کش پر نکوٹین کے جسم میں داخل ہونے سے سب کے چہروں پر رونق آگئی۔ سگریٹ کے ہر کش پر یوں محسوس ہوتا تھا گویا پانی سے بھری بالٹی میں رنگ ملایا جا رہا ہے۔ ایک کش کا اثر حلق سے لے کر ٹخنوں تک بلا واسطہ پہنچتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

سگریٹ ملنے کی خوشی ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ چابیوں کا منحوس گچھا ہمارے سامنے آگیا۔ اس روز قیامت کی گرمی تھی۔ اس گرمی میں شام کے پانچ بجے ہی سے الگ الگ کوٹھڑی میں بند ہونے کے خیال سے روح لرز رہی تھی۔ لیکن وقتِ مقررہ پر ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند ہونا پڑا۔

کوٹھڑی میں افکارِ پریشاں اور مچھروں کے ہجوم سے گھبرا کر میں نے چھپا ہوا سگریٹ نکال کر سلگایا مگر دو کش ہی لینے کے بعد ضمیر نے زبردست ملامت شروع کر دی۔ میں نے نمبردار کو آواز دے کر کہا "یہ جلتا ہوا سگریٹ لے جاؤ اور اس کے دو دو کش ہر کوٹھڑی میں تقسیم کر دو"

نمبردار نے پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر غالباً میرا مطلب سمجھ کر اس نے سگریٹ میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے دو کش خود لگانے کے بعد چلا گیا۔ جس کوٹھڑی کے سامنے وہ پہنچتا وہاں سے

سگریٹ کے یہ غیر متوقع کش ملنے پر خوشی کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ اپنی کوٹھڑی میں لیٹا جرم و سزا کے فلسفہ پر غور کرتا رہا۔ کس طرح ہماری جیلوں میں دن رات مجرم ڈھالے جاتے ہیں، کس طرح جیل میں ایک بار آنے کے بعد مجرم اور زیادہ مجرم ہو جاتے ہیں۔ اور محرومی اور پابندی انسان کو کن راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ اس کے بارے میں کسی فیصلہ پر پہنچنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

میرے سامنے پھر وہی منحوس رات تھی۔ وہی سیاہی، وہی خاموشی اور سناٹا تھا۔ زندگی نہ تھی، حرکت نہ تھی، کچھ بھی باقی نہ تھا سوائے اس کھردری اور سنگدل زمین کے جس پر ہم سب لیٹے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدت اور مچھروں کی یلغار اور مٹی کی یہ شام ایسی حقیقتیں تھیں جنہیں بہرحال برداشت کرنا تھا۔ کبھی کبھی ظہیر کاشمیری چلّا کر پوچھتا "توفیق کس حال میں ہے؟" تو کوئی جواب دے دیتا "شیر لوہے کے جال میں ہے!" اس کے بعد پھر خاموشی اور ویرانی کا تسلط ہو جاتا۔ زندگی کی کوئی لطافت نظر کے سامنے نہ تھی۔ حسن اور گیسو اور دراز پلکیں اور گدرائے ہوئے جسم، جن کے نغمے ہم ہمیشہ گاتے تھے، آج تصور کے احاطے سے بھی باہر تھے۔ ہم اس وقت صرف ان قاتل اور ڈاکو نمبرداروں کی حیثیت پر رشک کر رہے تھے جو باہر احاطے میں کھلے آسمان کے نیچے لیٹے ہوئے تھے، جب کہ ہم جنہوں نے کوئی جرم نہ کیا تھا، جن پر

کوئی فرد جرم تک عائد ہی نہ کی گئی تھی، ایسی کال کوٹھڑیوں میں بند تھے جن میں ہوا کا گذر ہی نہ ہو سکتا تھا۔

بُدھ پھانسی کا دن

یہ رات اسی طرح تڑپتے ہوئے گزری۔ صبح کا انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں مگر آج صبح ہونے پر بھی کوئی نمبردار ہمیں باہر نکالنے نہ آیا۔ چھ بج گئے، سات بج گئے، ساڑھے سات بجے جب سورج نکلے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا، مکھن نمبردار نمودار ہوا تو میں نے چیخ کر کہا "یہ کیا ظلم ہے، یہ کیسی زیادتی ہے کہ ہمیں دو گھنٹہ لیٹ کھولا جا رہا ہے؟"

نمبردار نے چابی گھماتے ہوئے کہا "کوئی زیادتی نہیں، بُدھ کے روز جیل کے پھانسی والے حصے میں پھانسی کی سزا پانے والوں کو پھانسی دی جاتی ہے، جب تک لاش تختے سے اتار کر ڈیوڑھی سے باہر نہ نکال دی جائے اس وقت تک کسی قیدی کو کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔"

اس آرڈر پر ظاہر ہے ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہم سب باہر نکل کر کمبل بچھا کر بیٹھ گئے۔ میں نے نمبردار سے کہا "یار ہم لوگ احاطے میں بند ہیں پھر ہمیں کوٹھڑیوں میں بند رکھنے سے کیا فائدہ؟ جب ہم احاطے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے، نہ ہی ہمیں عام قیدیوں سے ملنے کی اجازت

ہے، تو پھر یہ پابندیاں اور زیادتیاں کرنے سے کیا حاصل؟"

مگر بے چارہ نمبردار اس کا کیا جواب دے سکتا تھا، اسے صرف ایک ہی جواب یاد تھا "یہاں کا قانون ہی یہی ہے۔ بدھ پھانسی کا دن ہوتا ہے۔ اس دن قیدیوں کی گنتی بہت دیر سے کھلتی ہے"

پھانسی کے وقوعہ کے اعلان کے بعد فطری طور پر سب لوگ اداس نظر آنے لگے تھے۔ ایک زندگی اور ختم ہو گئی تھی۔ ایک قتل کرنے پر ایک اور آدمی قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ کیسے قانون اور کیسے علاج ہیں؟

تھوڑی دیر تک پھانسی کے مسئلہ اور فلسفہ پر بحث ہوتی رہی — مکھن نمبردار اپنے بیس سالہ تجربہ کی روشنی میں جلادوں کی قسمیں اور مختلف کڑیل جوانوں کے پھانسی کے تختے پر لٹکنے کے واقعات سناتا رہا۔ بڑے معلوماتی انداز سے اس نے بتایا کہ جیل کا جلاد تین پشتوں سے لوگوں کو مارنے پر مامور ہے، یہ اس کا خاندانی پیشہ ہے۔ ایک آدمی کو مارنے پر اسے دس روپے دئے جاتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو شراب بھی ملتی تھی مگر اب صرف دس روپے ملتے ہیں۔

"ایک آدمی مارنے پر دس روپے؟" غلام محمد نے پوچھا۔

"ہاں اور اس کا دودھ بھی لگا ہوا ہے" نمبردار نے حسرت سے کہا "پھر وہ تو یہ دعا کرتا ہو گا کہ دن میں دس دس آدمی پھانسی کی سزا پائیں"

دادا منصور نے کہا۔

"ہاں اور کیا؟" نمبردار نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نمبردار نے بڑے مدبّرانہ لہجے میں کہا "اس کا کام ہی یہی ہے۔ ایک بار اسے اس کام سے ہٹا کر دوسرا آدمی رکھ لیا گیا تھا ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے اسے صرف پھانسی گھر کی نگرانی پر مامور کر دیا گیا تھا لیکن ایک روز جب ایک جوان کو تختے پر کھڑا کیا گیا اور نیا جلاّد رسّی کھینچنے لگا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نئے جلاّد کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "جاؤ تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تمہاری رسّی سے جوان گھنٹوں تڑپتے رہتے ہیں۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا میں نے تو بڑے بڑے کڑیل جوانوں کو ایک جھٹکے سے زیادہ تکلیف نہیں ہونے دی ــــ" اور اس نے واقعی ایک ہی جھٹکے سے جوان کو ختم کر دیا ــــ"

بہت خوبصورت درخت ہے

باتیں کرتے کرتے ہمارے کمبل پر دھوپ آگئی تو ہم نے کمبل اٹھا کر پیپل کے درخت کے نیچے بچھا لیا اور سایہ میں پھر جم کر بیٹھ گئے۔ یہ درخت اس ریگ زار میں نخلستان کی طرح تھا۔ جیل کی اس زندگی میں جب ہر طرف

نفرت اور حقارت کے علاوہ کچھ بھی نظر نہ آتا تھا اور جب مٹی کی دھوپ اور کال کوٹھڑیوں کی سیاہیوں میں جہنم کی آگ دہکتی تھی اس وقت صرف یہ درخت تھا جو ہم سب کو اپنی آغوش میں لے لیتا تھا ہم اس روز بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد نمبردار بھاگتا ہوا آیا اور پھولی ہوئی سانس سے بولا "آئی جی صاحب جیل کے اندر آ وڑیا ہے، وہ ادھر ہی آرہا ہے" نمبردار یہ کہہ کر بھاگ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی کبھی وہ پگڑی کے پیچ ٹھیک کرتا، کبھی جوتی جھاڑتا، پھر بھاگ جاتا، پھر دوبارہ آتا اور ہمیں ہشیار رہنے کی تاکید کرتا۔ بیچ بیچ میں یہ بھی کہتا جاتا "یہ آئی جی صاحب ہمیشہ بغیر اطلاع دئے آجاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ آج کل کے افسر کیسے ہیں؟"

جس احاطے میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہ لمبا بہت زیادہ تھا۔ چوڑائی دروازے کے پاس تو کچھ زیادہ تھی لیکن آخر میں بالکل ایک لکیر سی بن کر رہ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ لمبائی کی طرف کی دونوں دیواریں اس طرح ترچھی تعمیر کی گئی تھیں جس طرح مثلث کی دو لکیریں ہوتی ہیں۔ ان دونوں دیواروں کے سامنے کوٹھڑیاں تھیں۔ دیواروں کو ترچھا تعمیر کرنے کا مقصد تھا کہ ایک دیوار کی کوٹھڑیوں میں بند ہونے والے قیدی سامنے کی کوٹھڑیوں کی قطار میں بند ہونے والے قیدیوں کو نہ دیکھ سکیں اور نہ کوئی اشارہ وغیرہ ہی کر سکیں دیواریں

ترچھی ہونے کی وجہ سے احاطہ کا صحن دروازہ کے پاس ذرا کھلا تھا مگر آخری سرے پر جہاں پیپل کا درخت تھا اور جہاں ہم سب دن کے وقت بیٹھتے تھے یہ صحن بہت ہی کم چوڑا تھا۔

نمبردار بھاگتا ہوا اس پورے احاطہ کا جائزہ بار بار لے رہا تھا۔ صفائی تو صبح ہی صبح ہو چکی تھی، اس طرف سے نمبردار مطمئن تھا جیل میں صفائی کا عجب طریقہ ہے۔ صبح صبح ہر نمبردار پانچ دس مشقتیوں کو گھیر گھار کر اپنے علاقے میں لے جاتا ہے۔ یہ مشقتی جو عام طور پر حوالاتی ہوتے ہیں، بالٹیاں لے کر پانی بھرتے ہیں۔ پھر پانی فرش پر گرا دیتے ہیں، دوسرا مشقتی کسی پھٹی ہوئی دری سے رسّی باندھ کر پانی کے اوپر سے دو چار بار پھیر دیتا ہے۔ اس عمل کو جیل کی اصطلاح میں پوچا کرنا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ روز کی طرح آج بھی ہمارے احاطے کے فرش پر پوچا ہو چکا تھا مگر نمبردار اپنے احاطے کی صفائی کے بارے میں اپنے اطمینان کا پورے طور پر اعلان بھی نہ کرنے پایا تھا کہ باہر سے احاطہ کا دروازہ کھلا اور دس بارہ جمعدار، پانچ سات اسسٹنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کی معیت میں آئی جی صاحب معہ جیل سٹاف کے دروازے میں سے نمودار ہوئے۔ دروازہ احاطہ کے ایک سرے پر تھا اور ہم لوگ دوسرے سرے پر تھے۔ چنانچہ ہم کافی دیر تک اس فوج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتے رہے۔ جب یہ سب لوگ ہمارے پاس پہنچے تو ہم اپنے

کمبل پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ خیال ہوا کہ ہم لوگوں کو آئی جی سے کہنا چاہئے کہ ہمارے ساتھ یہاں پر بالکل غیر انسانی سلوک ہو رہا ہے۔ ہم گرمیوں کی جہنمی راتوں میں ایسی کوٹھریوں میں بند کئے جاتے ہیں جن میں کوئی روشندان یا کوئی کھڑکی نہیں ہے وغیرہ۔ میں نے چپکے سے سب سے کہہ دیا۔ سب لوگ اس کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ ہمیں اب تک یہ ہرگز یقین نہیں تھا کہ قانون جس کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے، ایسا سنگین ہو سکتا ہے، اور انسان کو ایسی پابندیوں میں بھی رکھا جا سکتا ہے، جس طرح ہمیں رکھا جا رہا ہے۔

آئی جی صاحب بالکل ہمارے قریب پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے آگے بڑھ کر کہا "یہ سب لوگ سیاسی نظر بند ہیں"

آئی جی صاحب نے بڑی پسندیدگی سے سر ہلایا۔ ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ ہم سب پر ڈالتے ہوئے انہوں نے آنکھ اوپر اٹھا کر پیپل کے اس گھنے درخت کو دیکھا اور بولا "بہت خوبصورت درخت ہے۔ بیوٹی فل ٹری انڈیڈ" یہ فاضلانہ جملہ کہہ کر وہ پچھلے قدموں واپس چلے گئے۔

احاطہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہم سب مبہوت کھڑے دروازے کو دیکھتے رہے۔ یہ عظیم آئی جی صاحب جو سارے پنجاب کے جیلوں کے بے تاج بادشاہ ہیں، درخت کی تعریف کر کے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے خاک میں ملتے

موتیوں کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ انہوں نے فن اور آرٹ کے دیوانوں سے ایک بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے کسی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟" واہ واہ سبحان اللہ کیا آئی جی ہیں، کیا جیل ہے اور کیسی حکومت ہے جس کے یہ نمائندے ہیں اور یہ کیسا اُلٹا نظام ہے جس نے ہمیں اور آئی جی صاحب کو پیدا کیا اور بنایا ——— یہ سوال دیر تک ہمارے ذہنوں میں گھومتے رہے۔

اسی منحوس بُدھ کی شام کو، جس کی صبح دو آدمیوں کے پھانسی کے تختے پہ چڑھنے سے ہوئی تھی، ہمارے انچارج اسسٹنٹ پال صاحب تشریف لائے اور بولے "شوکت منٹو اور محمد افضل دونوں بی کلاس کے نظر بند تیار ہو جائیں"

"کہاں جانے کے لئے؟" ہم سب نے بیک وقت چیخ کر پوچھا۔

"یہ رموزِ مملکت ہیں، آپ کو نہیں بتلائے جا سکتے" واقعی رموزِ مملکت ہمیں کیسے بتائے جا سکتے تھے۔ رموزِ مملکت بتانے کا رواج ہوتا تو ہمیں سب سے پہلے یہ بتایا جاتا کہ ہمیں نظر بند کرنے کی وجوہات کیا ہیں۔ اور اس کے بعد کتنی ہزاروں ایسی باتیں ہیں جنہیں پوچھنے اور معلوم کرنے کے ہم مجاز ہوتے۔ اس لئے مملکت والوں نے یہ چیزیں نہ بتانے کا بہتر طریقہ دریافت کر لیا۔

افضل اور شوکت منٹو ہمارے پاس سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے

بعد ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا گویا کسی نے ہمارے جسم کے بعض حصے ہمارے جسم سے علیحدہ کر دیئے ہیں مگر بے چارگی اور بے کسی کا کچھ ایسا احساس تھا کہ ہم ایک دوسرے سے بھی کوئی بات نہ کر سکے۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد ہمیں نمبردار نے بڑے پُر اسرار لہجے میں بتایا کہ وہ جیل کے ایک دوسرے حصے اور نسبتاً بہتر جگہ پر چلے گئے ہیں۔ ان کی کلاس بی تھی اس لئے وہ بہتر جگہ پر رہیں گے اور ہم اسی سی کلاس والی جگہ پر رہیں گے اور ایک بار پھر اپنی منحوس زندگی پر غور کریں گے۔ ایک اور دیوار ہمارے اور ہمارے دو ساتھیوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھی۔ زندگی کتنی دیواروں میں بٹے گی؟ ابھی اور کون سا وقت باقی ہے؟ اندھیرے ایک اور خلیج حائل ہو گئی جس میں ہم سب موجود تھے مگر ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں سے ناواقف، دل کی گہرائیاں ہی نہیں ان کے وجودوں تک سے بے خبر تھے۔

بدھ کا یہ دن بڑا تاریخی دن تھا۔ اس لئے کہ شام ہی کو ہمیں یہ اطلاع بھی مل گئی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہمارے بار بار درخواست کرنے پر ہمیں کھانا خود پکانے کی اجازت دے دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ ہم تمام برتن، گھی اور دیگر سامان گھروں سے منگوائیں۔ جیل والے ہمیں روزانہ مونگ کی کچی دال، نمک مرچ، سرسوں کا تیل اور ایندھن دے دیا کریں گے۔

اس رحمت خسروانہ سے ہم اس قدر خوش تھے گویا دونوں جہان کی دولت مل گئی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب ہم چائے کا سامان، ڈبے کا دودھ، پتی اور شکر وغیرہ اپنے گھر سے منگوا کر چائے بھی بنا سکتے تھے مگر گھر والوں کو کیسے اطلاع دیں۔ باہر کی دنیا سے ہمارے تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ اس لئے ہم جمعرات کی ملاقات کے لئے ایک ایک لمحہ گن رہے تھے۔

ملاقات

جیل میں ملاقات کا دن عید سے کہیں بڑھ کر پیارا دن ہوتا ہے۔ اس لفظ کی شیرینی اور حلاوت سے قیدی مسحور ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی نمبردار یا سپاہی آ کر کسی قیدی کا نام پکارتا ہے اور ملاقات کا اعلان کرتا ہے تو قیدی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ یہ دن کتنی امیدیں، کتنے سہارے اور کتنی یادیں لے کر آتا ہے۔ یہ سب کچھ قیدیوں کے چہروں پر صاف لکھا نظر آتا ہے جن کا کوئی ملنے والا نہیں آتا وہ دوسروں کو حسرت بھری نظروں سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ملاقات کی خوشی ایسی خوشی ہے جسے الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔

میں بھی جمعرات کی صبح کو سویرے اٹھ بیٹھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے پر میں نے سب سے پہلے شیو کی۔ پھر نہا کر اور کپڑے بدل کر ملاقات کے

انتظار میں بیٹھ گیا۔

میرے اور ظہیر کاشمیری کے علاوہ اور کسی کو بھی ملاقات کا انتظار نہ تھا۔ کیونکہ پچھلی شام ہم نے معلوم کر لیا تھا کہ نظر بندوں سے ان کے بہن بھائی ماں باپ اور بیوی کے علاوہ اور کوئی ملاقات نہیں کر سکتا۔ دوست احباب کا تو ذکر ہی نہیں دور کے رشتہ دار بھی ملاقات نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اکثر ایسے تھے جن کا کوئی قریبی رشتہ دار لاہور میں موجود نہیں تھا۔ دادا منصور کا کوئی رشتہ دار شاید اس کرہ ارض پر موجود ہی نہیں تھا یا کم از کم ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ندیم کے بہن بھائی، بیوی اور والدہ ضلع سرگودھا کے ایک دورافتادہ گاؤں میں تھے، ان کا لاہور پہنچنا فی الحال تقریباً ناممکن تھا۔ خیال تھا کہ شاید ان کا بھانجا ظہیر بابر ملاقات کے لئے آئے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ حکومت اور پولیس اور حکومت، اور پولیس کا قانون بھانجے کو بھی قریبی رشتہ دار نہیں سمجھتے تو ظہیر بابر کی طرف سے بھی مایوسی ہو گئی اور ندیم چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ان کے بہت سے عزیز لاہور میں موجود تھے مگر حکومت کا اندھا قانون ان کو عزیز ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ غلام محمد کے ماں باپ، لائلپور کے کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ انھوں نے تو آج تک لاہور شہر کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ چنانچہ غلام محمد کو بھی ملاقات کی کوئی امید نہ تھی۔

آخر وہ ساعت بھی آ پہنچی جب احاطہ کا دروازہ کھلا اور ایک نمبردار نے

میرا نام لے کر پکارا۔ میں دیوانوں کی طرح اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس احاطہ سے ڈیوڑھی تک کا فاصلہ کوئی آدھ میل کے قریب ہوگا مگر مجھے یہ راستہ کئی ہزار میل کا معلوم ہو رہا تھا جو کسی صورت کٹنے ہی میں نہیں آتا تھا۔

جیل کی طرف ڈیوڑھی کا جو پھاٹک تھا وہ کھلا اور میں ڈیوڑھی میں سے گزر کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک کونے میں بنچ پر میری بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تکلیف ہم دونوں کو تھی مگر ہم میں سے کسی نے کوئی گلہ نہیں کیا بلکہ میں نے تو خوب ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور اسے خوش کرنے کی بھی کوشش کی مگر جو کرب اور بے چینی اس کے چہرے پر نمایاں تھی وہ کیسے چھپ سکتی تھی۔

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ملاقات کے لئے ایک گھنٹہ مقرر ہوتا ہے پہلے میں یہ سوچتا تھا کہ ملاقات کے لئے اتنا وقت بہت کم ہے مگر ملاقات کے دوران میں مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ اس اذیت کے لئے یہ وقت بہت زیادہ ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ معلوم ہونے لگا جیسے ہمارے پاس کوئی بات کرنے کو باقی نہیں رہی۔ اپنی تکلیفوں کا حال میں اس کو سنانا نہیں چاہتا تھا اور اپنی پریشانیوں کا حال وہ مجھے بتانا نہیں چاہتی تھی — پھر کیا بات کی جاتی، دکھوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کے علاوہ ہماری زندگیوں میں اور ہے بھی کیا۔ اگر ہم ان کا ذکر نہ کرنا چاہیں تو پھر گفتگو کے تمام دروازے

بند ہو جاتے ہیں۔

ملاقات بالآخر ختم ہو گئی۔ اور میں جب سگریٹ، شکر، گھر کا پکا ہوا گوشت حلوا اور پراٹھے اٹھائے اپنے احاطہ میں داخل ہوا تو سیاست خانہ ہمارے خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ میں بھی خوش تھا اور دوستوں کے نعروں میں شامل بھی ہو رہا تھا مگر اندر ہی اندر میرا جگر کٹ رہا تھا۔ اس لئے کہ میرے گھر میں اندھیرا تھا۔ اس عظیم شہر لاہور میں، کاروں، ہوٹلوں اور بنگلوں کے بھرے ہوئے بارونق شہر میں، میری بہن ایک چھوٹے سے محلہ سنت نگر کے ایک چھوٹے سے مکان میں بالکل اکیلی پڑی رہ گئی ہے۔ وہ بہن جو پچھلے پندرہ سال سے بیمار تھی۔ اس نے ملاقات پر مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا مگر اس کی پریشانی اور کرب ایسی چیزیں نہ تھیں جو اس کے چہرے سے پڑھی نہ جا سکیں اور ان کو پڑھ کر اپنی طبیعت پر قابو رکھنا مشکل کام تھا۔

ملاقات کے دن میں نے ضرورت کی جن چیزوں کا ذکر کیا تھا وہ اگلے ہی دن گھر والوں نے بھیج دیں۔ چنانچہ جمعہ کے روز میرا اپنا سوٹ کیس احاطہ کے دروازہ میں سے نمودار ہوا۔ نمبردار نے جو یہ سوٹ کیس اٹھائے تھا، بڑے زور سے پکارا "حمید اختر کا سامان گھر سے آیا ہے" ٹرنک کھولا تو اس میں سے گھی، چائے، آلو، مرچ، مصالحہ اور برتن غرضیکہ ضرورت کی تمام چیزیں برآمد ہو گئیں۔ اس روز غالباً جیل کے افسروں کا موڈ بھی اچھا تھا۔

اس لئے کانٹ چھانٹ بھی کم ہوئی۔ ٹرنک سر پر اٹھا کر میں دوستوں کے پاس پہنچا کیونکہ سب لوگ احاطہ کے دروازہ والے سرے کے مقابلے میں دوسری طرف دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ سے لے کر یارانِ طریقت تک پہنچنے کے وقفہ کے دوران میں میں ان تمام چیزوں کے نام پکارتا جاتا تھا جو ٹرنک میں موجود تھیں۔ جونہی میں ان کے پاس پہنچا، ندیم نے فوراً اٹھ کر میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور ہم نے اسی طرح سوٹ کیس سر پر اٹھائے ہوئے ناچنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کے سب اس ناچ میں شامل ہو گئے کیونکہ آج ہمیں چائے کا سامان بھی مل گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے چائے کا سامان نکالا گیا۔ چائے پکائی گئی اور ہم نے دس دن کے بعد چائے کا مزہ چکھا۔ اس دن ہم نے جی بھر کے چائے پی۔ چائے ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے کسی رفیق کی آواز آئی "حمید اختر کے گھر والے ——؟"

"زندہ باد ——!" سب لوگوں نے مل کر نعرہ لگایا۔

دن گزرنے لگے، دن گزرتے گئے۔ سیاست خانہ کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بھی وقت کسی نہ کسی طرح کٹتا رہا جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے بنانے والے انجینئر کو اس لئے انعام دیا گیا تھا کہ اس نے ان میں ہوا کا داخلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ وقت ان پابندیوں کے باوجود

گزر رہا تھا جن کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے جن کی وجہ جواز سمجھ میں نہ آسکتی تھی، ایسی ایسی پابندیاں جن کا کوئی مطلب یا مقصد سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پہ ہمیں آگ جلانے اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن ماچس رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ سبزی ہمیں جیل کے باغیچہ سے باقاعدہ ملتی تھی مگر اسے کاٹنے کے لئے چاقو یا بلیڈ رکھنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ شیو کا سامان رکھ سکتے تھے مگر بلیڈ باہر چکر میں جمع کرنے پڑتے تھے جو حجامت کے وقت ہی مل سکتے تھے اس کے بعد پھر وہیں جمع کر دیے جاتے، نتیجے کے طور پہ ہمارے بلیڈ دن بھر منشیوں، جمعداروں اور وارڈروں کی حجامت بنانے کے کام آتے۔ جب ہم ان بے ہودہ پابندیوں کے متعلق شکایت کرتے تو ایک ہی جواب ملتا۔ وہ یہ کہ رولز یہی ہیں، اور یہ کہ یہ جیل خانہ ہے۔

سامان آنے کے بعد سے کھانا پکانے اور چائے تیار کرنے کی ذمہ داری غلام محمد اور حسن عابدی نے لے لی۔ سبزی کاٹنے کا کام ندیم نے سنبھالا۔ وہ پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتا اور لوہے کے ایک ٹکڑے سے سبزی کاٹ کاٹ کر پلیٹ میں رکھتا رہتا۔ اس کے اس سٹائل کی وجہ سے کبھی کبھی ہم لوگ اس کو بھابی کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

بہر حال برِ عظیم پاک و ہند کے اس عظیم فنکار کا سبزی کاٹنے کا منظر دیکھنے

کے قابل ہوتا۔ لوہے کے ٹکڑے سے سبزی ٹھیک سے نہیں کٹتی تھی مگر ندیم مسکراتا ہوا روزانہ سبزی لے کر فوراً ہی کاٹنا شروع کر دیتا۔

سبزی اور دال خود پکانے اور چائے کا انتظام ہو جانے کی وجہ سے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ہم پر ایسی پابندیاں عائد تھیں جن کی وجہ سے ہم جیل ہی کے دوسرے قیدیوں سے بھی نہیں مل سکتے تھے۔

مکھن نمبردار ہی واحد آدمی تھا جس کا تعلق ہم سے اور جیل کی باقی دنیا سے بیک وقت تھا۔ وہ ہمیں باہر کی باتیں تو سناتا تھا مگر اس کا اندازِ گفتگو سخت تکلیف دہ تھا۔ وہ دن بھر ہمیں جی بھر کے بور کرتا۔ گفتگو کے دوران میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک ہی سانس میں جملہ پورا نہ ہو۔ ایک دو لفظ بولنے کے بعد وہ رک کر سانس لیتا۔ پھر بولتا، پھر سانس لیتا۔ اتنی دیر میں ہم لوگوں کا کام تمام ہو چکا ہوتا مگر اسے اس کی پروا نہیں تھی۔

حاتم طائی

سیاست خانہ میں مکھن نمبردار کے علاوہ ہماری ملاقات ہفتے کے ہفتے حجام سے بھی ہو جاتی تھی۔ یہ حجام پریڈ سے ایک روز پہلے یعنی پیر کے روز ہماری حجامتیں بنانے آتا تھا۔ ستر سال کے قریب عمر تھی۔ اس کی مہندی لگی

داڑھی ناف تک لٹکی رہتی تھی۔ صورت شکل سے بھی وہ نہایت پُراسرار معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اس کا نام اس کی صورت کی رعایت سے حاتم طائی رکھ دیا تھا۔

پہلی ملاقات پر ہم لوگوں نے اس سے پوچھا "حاتم طائی! تمہاری سزا کتنی ہے؟"

حاتم طائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جناب سزا کی بات چھوڑو۔ اپنی ساری عمر یہیں گزری ہے۔ بس دو چار روز کے لئے باہر جاتا ہوں پھر یہیں ٹھکانہ ملتا ہے۔ پہلی بار چودہ سال کی عمر میں جیل میں آیا تھا۔ اس وقت پینسٹھ سال کا ہوں۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے!"

"معلوم ہوتا ہے باہر جا کر تمہارا دل نہیں لگتا اس لئے فوراً واپس آ جاتے ہو!" غلام محمد نے پوچھا۔

"قبلہ باہر کی دنیا بھی کوئی رہنے کے قابل ہے؟" حاتم طائی نے جواب دیا "میں تو اس نامعقول اور ظالم دنیا میں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ بڑے بُرے لوگ ہیں باہر والے، بڑے بیہودہ اور غیر انسانی سلوک کرنے والے، اس لئے میرا تو وہاں جا کر دم گھٹنے لگتا ہے" قینچی ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے بڑے فلسفیانہ انداز سے کہنا شروع کیا "وہ جس کیس میں میں اب سزا بھگت رہا ہوں اس میں پولیس والے مجھے جیل میں نہیں بھیجتے تھے بلکہ

ریمانڈ پر ریمانڈ لئے جا رہے تھے اور خوب مارتے بھی تھے۔ آخر تنگ آکر میں نے ایک روز عدالت سے واپس آتے ہوئے ایک خشک کنواں تاڑ لیا اور بھاگ کر مع اس سپاہی کے اس میں کود پڑا جس کے ہاتھ میں میری ہتھکڑی کی زنجیر تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" دادا منصور نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہونا کیا' میرا بازو ٹوٹا اور سپاہی کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر مجھے اسی شام جیل بھیج دیا گیا۔

ظہیر کاشمیری نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے خطیبانہ انداز میں کہا "دیکھو حاتم طائی! اب تم بوڑھے ہو چکے ہو' اب اس چوری چکاری کے کام کو چھوڑ دو۔ دیکھو! اب جب تم باہر نکلو تو مجھے بیڈن روڈ کے ناکے پر تلاش کر لینا۔ میں تمہارے لئے ایک دکان کا بندوبست کر دوں گا۔ تم ایمان کی روٹی کما کر کھانا اور اپنی زندگی کے آخری دن آرام سے کاٹ لینا"

حاتم طائی نے حجامت کے اوزار زمین پر پھینک دئے اور غصے میں آکر اُٹھ کھڑا ہوا چیختے ہوئے اس نے کہا "دیکھئے جناب آپ شریف آدمی ہیں' اس لئے آپ کی بات کا وہ جواب نہیں دوں گا جو مجھے دینا چاہئے —— باہر نکل کر آپ میرے لئے جو اچھا کام کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی اچھا سا مکان نظر میں رکھئے۔ جب میں بیڈن روڈ کے ناکے پر آپ سے ملوں تو مجھے اس مکان

کے سامنے سے ایک دفعہ لے جانا۔ نقب میں لگاؤں گا۔۔۔ حصہ آدھوں آدھ ہا۔۔۔۔"

حاتم طائی کی اس بات پر سب لوگ ہنسنے لگے تو وہ بیٹھ گیا اور بڑی نرم اور پُراسرار آواز میں ظہیر سے کہنے لگا "آپ لوگ یونین وونین بناتے رہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ آپنے ہم لوگوں کی کوئی یونین نہیں بنائی حالانکہ ہمیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ چوروں کی یونین اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض چور بالکل لاوارث ہوتے ہیں۔ ان کا نہ کوئی مقدمہ لڑتا ہے نہ کوئی ان سے ملاقات کرنے آتا ہے۔ اگر یونین ہو تو وہ ان کا مقدمہ لڑے، ان کو ضرورت کا سامان پہنچائے اور ان کی خبر گیری کرتی رہے"

ظہیر کاشمیری نے کوئی جواب نہ دیا تو حاتم طائی نے کہا "چور دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی اور ذریعہ میسر نہیں آتا تو وہ پیٹ پالنے کے لئے چوری کرتا ہے اس لئے اس کی یونین آپ کو بنانا ہی پڑیگی، پریذیڈنٹ آپ ہی بن جائیے۔۔۔۔"

پاگل وارڈ

ہماری بیرک کے ساتھ ہی آٹھ نمبر احاطہ تھا جسے عرف عام میں پاگل وارڈ کہا جاتا تھا۔ ایک روز جمعدار نے ہمارے احاطے کا دروازہ کھولا تو ایک نیم پاگل

اُچھلتا کودتا ہمارے احاطہ میں آپہنچا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ندیم پر پڑی، فوراً بولا "اخاہ آپ ہیں جناب! دیکھئے حضور میرے بتیس بچے ہیں۔ میرے نہیں میری بیوی کے ـــــ اور ان لوگوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا ہے اب میری بیوی میری غیر حاضری میں کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی تو میں کیا کروں گا ـــــ؟"

باتیں کرتے کرتے اچانک اس کی نظر ظہیر کاشمیری پر پڑ گئی۔ فوراً بولا "اوہو حضور آپ کیا چیز ہیں؟ آپ انگریز ہیں یا فرانسیسی، روسی ہیں؟ ہندوستانی ہیں؟ پاکستانی ہیں؟ یا امریکی ہیں؟" پھر کچھ سوچ کر بولا "آپ کے بارے میں تو کچھ وہی بتا سکتا ہے جو ولی اللہ ہو ـــــ"

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ جمعدار اسے پکڑ کر لے گیا۔

چند دنوں کے بعد ندیم کا سامان گھر سے آیا تو اس میں سے تاش کا ایک پیکٹ بھی برآمد ہوا۔ مجھے تاش کھیلنا نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس کی باقاعدہ ٹریننگ دی گئی۔ تاش آنے کے بعد سے دن بھر تاش کا بازار گرم رہنے لگا۔ ویسے تو وقت گزارنے کے لئے تاش سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہے مگر جیل میں تاش کے کچھ اور ہی مزے ہیں۔ ہم اس خشوع و خضوع کے ساتھ تاش کھیلتے، چلتے پیتے اور اس بے فکری سے لطیفے اور چٹکلے بیان کرتے گویا کسی شادی بیاہ میں آئے ہوئے ہیں۔ ان مجلسوں میں صرف مکھن نمبردار کی مداخلت تکلیف کا

باعث تھی۔ وہ ہر وقت اپنی گفتگو سناتا رہتا اور سب کو بور کر دیتا۔ مجھے وہ حمید اختر کی بجائے ہیچ اختر اور ظہیر کو ہجیر کہتا۔ ایک روز سگریٹ نوشی کی کوئی بات ہو رہی تھی کہ بولا "اپنے ہجیر کشمیری تو بھنگی چرسی معلوم ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے باہر بھی نشہ پانی کرتے رہے ہیں"

ایسے ہی وقت گزرتا رہا۔ اب ہم لوگ اس زندگی کے عادی ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم نے جیل میں رہ کر کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور تاش کھیلنے کے فنون میں مہارت حاصل کر لی۔ کپڑے دھونے میں میں سب سے پھسڈی تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ ندیم کپڑے دھونے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ دادا منصور تو خیر جیل میں سالہا سال رہ کر کپڑے دھونا سیکھ گئے ہوں گے۔ غلام محمد اور ظہیر بھی پہلے جیل کاٹ چکے تھے مگر ندیم میں یہ صلاحیت خداداد معلوم ہوتی تھی۔ کپڑے دھونے کے بعد جب مقابلہ ہوتا تو ندیم کو اول نمبر کے انعام کا "مستحق" قرار دیا جاتا۔

اسی دوران میں ہم پر چند خوفناک مصیبتیں پڑیں۔ ایک روز ایک جمعدار احاطہ میں آکر بولا "حسن عابدی تیار ہو جائیے، اس کی رہائی آئی ہے"

حسن عابدی کو ہم نے خوشی خوشی رخصت کیا۔ بعض لوگوں نے تو اپنے گھر والوں کو اس کی معرفت پیغام بھی بھیجے۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد ہمیں معلوم ہو گیا کہ حسن عابدی رہا نہیں ہوا بلکہ اسے جیل سے تبدیل کر کے شاہی قلعہ میں

بھیج دیا گیا ہے جہاں پر پولیس والے اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔ ہمارے پاس سے اسے اس بہانے اس لئے نکالا گیا تھا کہ وہ جانے سے انکار نہ کر دے اور ہم لوگ کوئی فساد برپا نہ کر دیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ جیل میں چونکہ نظر بندوں کو دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کا حکم ہے اس لئے ایسے موقعوں پر ان کو اصل بات کبھی نہیں بتائی جاتی۔ ایک نمبر دار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو یہ کہہ کر لے جائیں کہ اس کی رہائی آئی ہے اور جا کر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیں۔"

گرمی کی شدت میں اندر سونے کی وجہ سے ہم سب کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ دادا منصور اور ظہیر کی حالت تو کافی خراب ہو گئی تھی مگر ہم مل جل کر وقت گزار رہے تھے۔ یہ ڈر ہر وقت ساتھ لگا رہتا تھا کہ کہیں الگ الگ نہ کر دئے جائیں۔ حسن عابدی کی جدائی بہت تکلیف دہ تھی۔ ہم سب اسے یاد کرتے اور سوچتے رہتے کہ شاہی قلعہ کی سنگین دیواروں کے درمیان اس منحنی اور مختصر لڑکے کے ساتھ معلوم نہیں کیا گزر رہی ہے؟ قلعہ کی روایات ہی اس قسم کی ہیں کہ ان کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہمارے سامنے تو ایک زندہ مثال بھی موجود تھی۔ حسن عابدی جس روز گیا تھا اسی روز ایک لڑکا رشید ہمارے احاطہ میں قلعہ سے آیا تھا۔ وہ کوئی مہینہ بھر قلعہ میں رکھا گیا تھا اس کے بعد اسے سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ بے چارہ دو کا ندار قسم کا آدمی تھا کسی زیر زمین فیق

کارشتہ دار تھا۔ اس کا پتہ پوچھنے کے لئے اسے بھی سیفٹی ایکٹ میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسے سیاست سے کوئی واسطہ تھا نہ ادب سے، مگر اسے پکڑ کر اندر ڈال دیا گیا ــــ قلعہ سے آنے کے کوئی چار روز بعد تک اس کی حالت یہ تھی کہ وہ بیٹھا بیٹھا رونے لگتا، کبھی چیختا، کبھی اپنے دکھتے ہوئے جسم کو دباتا۔ رات کو سوتے میں زور زور سے چلاتا "مجھے مت مارو، مجھے کچھ معلوم نہیں" یا پھر چیختا کہ "میں نے کچھ نہیں کیا ــــ ہائے مار ڈالا وغیرہ" اس نے قلعہ کے ایک مہینہ کی جو سرگزشت بیان کی اسے لکھنے کی قانون اجازت نہیں دیتا۔ نہ ہی میں ابھی قلعہ میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر بہرحال اس کی حالت سے ہم حسن عابدی کے متعلق اندازہ ضرور لگا لیتے تھے اور اسی وجہ سے اس کے بچھڑنے کا غم کچھ اور بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

کچھ اور بھی تیر ہاں تیرے

ندیم، ظہیر اور میرے گھر سے سامان باقاعدہ آجاتا تھا جس سے سب کا نشستم پنشتم گزارہ ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ سامان کو بڑی باقاعدگی سے صرف کرتے اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی مشق کرتے رہتے تھے مگر جونہی ذرا سا اطمینان ہوتا کوئی نہ کوئی افتاد پڑ جاتی۔ ایک شام پال صاحب احاطہ میں داخل ہوتے ہی بولے "فیروزالدین منصور! اپنا سامان تیار کرو اور میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟ کیوں؟" سب نے بیک آواز پوچھا۔

مگر وہ جواب دینے کے لئے تیار نہ تھا کہ رموزِ مملکت یہی ہیں اور قانون ہمیں اندھے، بہرے اور گونگے بنا کر رکھنے پر مصر تھا۔ دادا رخصت ہو گئے اور ہم سب پریشان اور متفکر ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک اور ساتھی بچھڑ گیا۔ کتنے دوستوں، کتنے ساتھیوں سے بچھڑ کر ہم یہاں جمع ہوئے تھے مگر یہاں بھی چین نہیں ملتا تھا۔ ہم تو ایک جان ہو کر رہ رہے تھے۔ ہمیں باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنے ہی میں مست تھے لیکن یہ ذرا سی خوشی، یہ ذرا سی راحت بھی چھین لی گئی اور جیسے ہمارے جسموں کا ایک اور حصہ کٹ کر ہم سے علیحدہ ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک جمعدار ظہیر کو بھی لے گیا مگر اس کی زبانی چوری چھپے یہ معلوم ہو گیا کہ دادا اور ظہیر کہیں باہر نہیں جا رہے ہیں بلکہ انہیں جیل کے ہسپتال میں رکھا گیا ہے۔ دادا سے ایک روز پہلے بھی ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہیں زبردستی بغیر کچھ بتائے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد سیاست خانہ کی اس سات نمبر بیرک میں صرف ندیم، غلام محمد، رشید دوکاندار اور میں باقی رہ گئے۔ ہماری صحت بھی خراب ہونے لگی۔

ابھی ہم ان ساتھیوں کے بچھڑنے کے صدمے کو پوری طرح برداشت بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک صبح کا اخبار احمد علی اور ضیاءالاسلام کی گرفتاری کی خبر لایا۔

اس گرفتاری کا صدمہ تو سب کو تھا مگر ندیم تو بہت زیادہ پریشان تھے۔ اگلی صبح ندیم کے بجائے ظہیر بابر کی گرفتاری کی خبر بھی آ گئی۔ یہ خبر پڑھ کر ہیں سنّاٹے میں آ گیا ہم سب خاموش تھے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا باہر کیا ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا گویا ساری پبلک گرفتار ہو جائے گی اور جیلوں سے باہر صرف وزرائے کرام اور پولیس کے سپاہی رہ جائیں گے۔ میں بار بار ندیم کو دیکھتا تھا مگر بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ آخر میں نے کہا "اب تو آپ کے گھر میں کوئی بھی باقی نہیں رہا"

"ہاں! اور اب مجھے غالباً سگریٹ اور ضرورت کا سامان بھی نہیں پہنچے گا" ندیم نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا "چلو یہ وقت بھی کٹ جائے گا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

ان خبروں کے آنے کے بعد بھی جب میں نے ندیم کے چہرے پر وہی بشاشت اور رونق دیکھی تو میں نے اس رومانی شاعر کے عزم اور حوصلہ کو پہلی بار محسوس کیا۔ اس کی طبیعت کے اس رُخ کو دیکھ کر، جو اب تک میری نظروں سے پوشیدہ تھا، مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ اس روز میں نے اپنے اندر نیا عزم، نیا حوصلہ اور نئی قوت محسوس کی۔ باحوصلہ اور اولوالعزم دوستوں کی رفاقت کتنی بڑی نعمت ہے، یہ مجھے اس دن اچھی طرح معلوم ہو گیا۔

ہم لوگ ہر ہفتے پریڈ کے موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب سے درخواست کرتے تھے

دی جائے قیدیوں کی ان کال کوٹھڑیوں سے منتقل کر کے کسی بہتر جگہ پر رکھا جائے ورنہ ہم سب ہسپتال پہنچ کر دم دے دیں گے۔ غالباً میڈیکل آفیسر نے بھی اپنی رپورٹ میں اس تشویش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ سات جون کو ہمیں حکم مل گیا کہ سات نمبر ریاست خانہ سے اپنا بوریہ بستر سمیٹ کر چودہ نمبر بارک میں پہنچ جائیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ چودہ نمبر بارک میں ہمیں باہر سونے کی اجازت ہوگی۔ شام کے کوئی تین بجے ہم لوگ اپنے اپنے بستر اٹھوا کر چودہ نمبر بارک کی طرف روانہ ہو گئے

پھانسی کی کوٹھریاں

چودہ نمبر بارک، جہاں سیاست خانے سے تبدیل کر کے ہمیں بھیجا گیا تھا۔ دراصل ان لوگوں کے لئے مخصوص تھی جنہیں سیشن کی عدالت سے سزائے موت مل چکی ہوتی ہے۔ جیل میں ملزم اس وقت تک حوالاتی کہلاتے ہیں جب تک کسی عدالت سے انہیں باقاعدہ سزا نہ مل جائے۔ عام قیدی بھی چار چار چھ چھ ماہ کی سزا بھگتنے کے بعد جب عدالت سے سزا کا پروانہ حاصل کرتے ہیں تو اس کے بعد سے ان کی سزا شروع ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض ملزم حوالات میں دس دس ماہ کاٹتے ہیں، اس کے بعد انہیں عدالت دو ماہ کی سزا سُنا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں قیدی دراصل بارہ مہینے جیل میں کاٹتا ہے لیکن سزا اس کی دو ہی ماہ

ہوتی ہے۔ پہلا عرصہ کسی گنتی میں شمار نہیں ہوتا۔

قتل کے ملزموں کے ساتھ تو اور بھی سخت برتاؤ ہوتا ہے۔ وہ جتنی دیر سیشن سپرد رہیں، اتنی دیر جیل میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں مگر جونہی عدالت انہیں سزائے موت کا حکم سُناتی ہے، ان کو سیمنٹ کی پختہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں وہ دن رات بند رہتے ہیں۔ یہ کوٹھڑیاں جیل کی اصطلاح میں کوٹھیاں کہلاتی ہیں ان کا رقبہ زیادہ سے زیادہ پچیس مربع فٹ ہوتا ہے۔ جہاں پھانسی کی سزا پانے والے دن رات بند رہتے ہیں۔ ان کے ورثا کی طرف سے ہائیکورٹ میں اپیل ہوتی ہے۔ وہاں سے موت کی سزا کی توثیق ہونے کی صورت میں فیڈرل کورٹ میں اور پھر گورنر جنرل کے پاس رحم کی اپیل کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ برسوں چلتا ہے۔ جب سرکاری مشینری اچھی طرح کام کرتی تھی، تب اس سارے عمل کے لئے دو چار مہینے لگتے تھے مگر آج کل اپیلیں اور فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دس بارہ ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ لگنا بہت معمولی بات ہے۔ اس سارے عرصے میں یہ مجرم دن رات کوٹھڑیوں میں بند رہتے ہیں ان کے جسم، ان کی شکل اور ان کی عادتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ان کے چہروں پہ ہلدی کی سی زردی چھائی رہتی ہے مگر وہ موت کے انتظار میں زندہ رہنے کی موہوم امیدوں میں اپنی کوٹھڑیوں میں مہینوں بند رہتے ہیں۔ یہ چودہ نمبر بیرک بھی ایسی ہی تھی جس میں پھانسی کی سزا پانے والے رکھے گئے تھے اور جہاں

ہمیں اب منتقل کیا جا رہا تھا۔

اس بیرک کا دروازہ چھوٹا سا تھا۔ سیاست خانے کے لکڑی کے دروازے کے مقابلے میں یہ دروازہ مضبوط لوہے کا بنا ہوا تھا۔ سیاست خانہ اور دوسری بیرکوں پر تالے بھی عام طور پہ باہر لگتے تھے لیکن یہ بیرک اندر کی طرف سے مقفل تھی۔

ہمارا قافلہ ایک جمعدار کی رہنمائی میں اس دروازے پر پہنچا۔ جمعدار نے اس آہنی دروازے کے سوراخ میں منہ ڈال کہ اندر سے کسی دوسرے جمعدار کو پکارا۔ پانچ منٹ تک تحقیق تفتیش ہوتی رہی۔ اس کے بعد دروازہ کھلا تو ہمارے اپنے جمعدار نے ہمیں اس نئے آدمی کے حوالے کر دیا۔ لیکن دروازے میں سے گزر کر اندر پہنچنے پر جو منظر ہماری آنکھوں نے دیکھا وہ اس قدر خوفناک اور غیر انسانی تھا کہ بہت دیر تک طبیعت خراب رہی۔

یہ بھی انسان ہیں

دروازے میں سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی ہم نے دائیں بائیں دیکھا تو ہمیں آمنے سامنے کوٹھڑیوں کی دو لمبی قطاریں دکھائی دیں جن کی تعداد اسی کے لگ بھگ تھی۔ ان کوٹھڑیوں کے سامنے لوہے کے سلاخ دار جنگلے تھے جن کے باہر بڑے بڑے قفل لٹک رہے تھے۔ کوٹھڑیوں کے دروازوں کے باہر کے

پچھوں کو برآمدے کے طور پہ بنایا گیا تھا اور ان برآمدوں میں جیل کے باوردی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ہر چار کوٹھڑیوں پر ایک سپاہی مقرر تھا جو ان کوٹھڑیوں کے سامنے برابر گشت کرتا رہتا تھا۔ اس طرح یہ موت کے منتظر لوگ سیمنٹ کی بنی ہوئی پختہ اور مقفل کوٹھڑیوں میں سپاہیوں کی نگرانی میں چوبیس گھنٹے بند پڑے رہتے ہیں۔

ہم لوگ دن کے کوئی ڈھائی بجے کے قریب اس بیرک میں لائے گئے تھے جون کی اس تپتی دوپہر میں ان پختہ کوٹھڑیوں میں اسّی ۸۰ ایسے آدمی جلتے ہوئے فرش پر لیٹے ہوئے تھے جن کی زندگی کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کب ختم ہوتی ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جنہوں نے کُرتے اتارے ہوئے تھے اور صرف پائجامے پہنے ننگے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان قیدیوں کو پائجامہ میں آزار بند رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی مبادا وہ خودکشی کر لیں۔ یہ بجھی بجھی آنکھوں والے بے آسرا خاموش لوگ پائجاموں کو دھوتی کی طرح باندھے خلا میں گھُور رہے تھے۔

ان لوگوں کی ان دو رویہ کوٹھڑیوں کے بیچوں بیچ ہمارا راستہ تھا۔ ہمارے دونوں طرف انسان جنگلوں میں مقیّد تھے۔ انسان اتنی مجبوری کی حالت میں اس سے پہلے ہم میں سے غالباً کسی نے بھی نہ دیکھا ہوگا چنانچہ ہم سب کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔ ایک نظر ان کو دیکھنے کے بعد ہمیں دوبارہ ان کی طرف

دیکھنے کی جرأت نہ ہو رہی تھی۔ ہم سب سر جھکائے موت کی اس وادی سے گزر گئے اور ہمیں ان کوٹھڑیوں کے عین پیچھے اسی طرح کی چند اور کوٹھڑیوں میں پہنچایا گیا۔ پھانسی کی کوٹھڑیوں کے روشندان ہماری کوٹھڑیوں کے دروازوں کے بالکل سامنے تھے۔

اس نئی جگہ پہنچنے پر ہمیں جو آدمی سب سے پہلے ملا وہ شمیم اشرف ملک تھا۔ اس کی گرفتاری کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ ہم تک نہ پہنچی تھی۔ اس نے بتایا کہ گرفتاری کے بعد وہ تین روز شاہی قلعہ میں رکھا گیا۔ اسے اسی دن وہاں سے جیل بھیجا گیا تھا۔ اس کے اس طرح ملنے سے ہم سب کو صدمہ بھی ہوا اور خوشی بھی، اس لئے کہ کسی بھی ساتھی کے گرفتار ہونے سے صدمہ ہوتا ہے۔ مگر جیل میں پرانے دوستوں کی رفاقت کے خیال سے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔

جیل رولز یا قید تنہائی

اسی شام اس بیرک کے انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چودھری نصر اللہ صاحب تشریف لائے تو شمیم اشرف نے ان سے شکایت کی کہ صبح سے کئی بار مانگنے کے باوجود اسے اب تک جیل رولز نہیں دئے گئے —— اس نے اسسٹنٹ صاحب سے ایک بار پھر نظر بندوں کے رولز طلب کئے۔

اگلی صبح ایک آدمی نے جو ڈیوڑھی سے آیا تھا کہا "شمیم اشرف کو ڈیوڑھی بلایا جا رہا ہے"۔ شمیم اشرف ڈیوڑھی چلا گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد ایک اور نمبردار نے آکر اعلان کیا کہ "شمیم اشرف کا سامان بھی ڈیوڑھی جائے گا"

چنانچہ اس کا ٹرنک اور بستر بھی ڈیوڑھی پہنچ گیا۔ مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ شمیم کہاں چلا گیا' اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ کبھی سوچتے کہ وہ دوبارہ پوچھ گچھ کے لئے قلعہ لیجایا گیا ہے۔ کبھی خیال آتا کہ اسے لاہور جیل سے تبدیل کر کے کسی اور جیل میں بھیج دیا گیا ہوگا۔ صحیح بات کسی طور معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔

شام کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف لائے تو ہم نے ان سے پوچھا "جناب وہ شمیم اشرف صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟"

انہوں نے مختصر سا جواب دیا "وہ سیاست خانہ کے پاگل وارڈ میں بیٹھا جیل رولز پڑھ رہا ہے!"

اگلے روز ہمیں معلوم ہوا کہ نظر بندوں کے قوانین مانگنے کے جرم میں شمیم اشرف کو سیاست خانہ کے ایک وارڈ میں تنہا بند کر دیا گیا ہے۔ اس وارڈ میں پاگل اور جنونی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ شمیم اشرف کو اس لئے رکھا گیا تھا کہ اس نے قوانین مانگنے کی جرأت کی تھی۔ ان قوانین میں سب سے پہلا قانون یہ تھا کہ ہر نظر بند کو اس کے مانگنے پر یہ قوانین مطالعہ کرنے کے لئے دئے جائیں

اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ جیل کے افسر قوانین کی مٹی کس طرح پلید کرتے ہیں۔

اس نئی جگہ پہنچ کر ہم سب دو تین روز تک اجنبیت کے احساس تلے دبے رہے۔ یہ بات عجیب تو معلوم ہوتی ہے جیل ایک ہی تھی مگر جگہ بدلنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ہم کسی دوسری دنیا میں آ گئے ہیں۔ ایک زندگی وہ تھی، جسے ہم جیل کی چار دیواری سے باہر چھوڑ آئے تھے، دوسری وہ زیادہ تھی جو سیاست خانہ کی چار دیواری میں رہ گئی تھی اور اب یہ تیسری جگہ تھی۔۔ نہ معلوم اس کو چھوڑ کر کس کس کو کب اور کہاں جانا پڑے۔ اس خیال سے سب پریشان رہتے تھے۔ سیاست خانہ میں ایک مہینہ گزارنے کے بعد ہم لوگ، اس کی سیاسیات سے واقف ہو چلے تھے مگر نئی جگہ کے بارے میں تو خالص اجنبیت کا احساس تھا نئی جگہ پر بجلی کی روشنی نے سارے گلے شکوے دور کر دیئے ایک مہینہ تک روشنی سے مکمل طور پر محروم رہنے کے بعد پہلی بار رات کو بجلی کی روشنی نصیب ہوئی تو ہم لوگ جون کے مہینہ میں کوٹھڑی کے اندر سونے کی تکلیف تک کو بھول گئے۔ کچھ کتابیں بھی گھر سے آ گئی تھیں اس لئے ہم لوگ رات کو دیر تک پڑھتے رہتے۔ فرصت ہی فرصت تھی اور مہینہ بھر کی پیاس دور کرنے کیلئے جتنا مواد بھی ملتا پڑھتے لیکن مصیبت یہ تھی کہ کتابیں بہت ہی کم تھیں۔ کتابوں کو گھر سے ہم تک پہنچنے میں بڑی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں۔ قاعدہ کے مطابق

کتابیں ڈیوڑھی میں جمع ہوتیں، پھر سی، آئی، ڈی کے دفتر میں سنسر کرانے کیلئے بھیجی جاتیں، پھر واپس جیل کی ڈیوڑھی میں آتیں تب کہیں جا کر ہمیں ان کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا۔ اس سلسلے میں قانون جو کچھ بھی تھا اس میں وقت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی یعنی ڈیوڑھی میں جمع ہو جانے کے بعد جیل والوں پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے کہ وہ کتنے دنوں میں انکو سنسر کرانے کیلئے بھجوائیں۔ ایسا بھی ہوا کہ ہفتہ ہفتہ بھر کتابوں کے پلندے جیل ہی میں پڑے رہے۔ پھر سی، آئی، ڈی کے پاس پہنچنے کے بعد ان پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ چاہے جب تک رکھ چھوڑیں۔ بہر حال کتابیں کم تھیں مگر ہم نے انہیں بانٹ کر باری باری پڑھنا شروع کر دیا۔ دو چار روز کے بعد ڈاکٹری رپورٹ کی وجہ سے ہمیں رات کو باہر سونے کی اجازت بھی مل گئی۔ لیکن پھانسی والوں کے قرب کی وجہ سے ذہنی اذیت کسی طرح بھی کم نہ ہوتی تھی۔

شام ہوتے ہی پھانسی والے چلّا چلّا کر ایک دوسرے کو پکارتے۔ جونہی شام کے سائے گہرے ہوتے اور شام کا جادو چاروں طرف پھیل جاتا، پھانسی والوں کی بے چینی بڑھتی ہوئی نظر آتی۔ ان کی روح کی بے چینی اور ان کا اضطراب ان کی آوازوں سے صاف جھلکتا تھا۔ ان کی گفتگو عام طور پر ایک ہی قسم کی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی ایک، اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے چلّا کر پکارتا "او بے خبریا اوئے!"

"او ئے جی اوئے!" جواب ملتا۔

"السلام علیکم! کیا حال ہے؟"

"شکر ہے اللہ رحم کرے گا، اللہ کوٹھی توڑے گا"

"آمین! آمین!"

ان جملوں میں زندہ رہنے اور موت کی اس تاریک وادی سے بچ نکلنے کی ایک لرزتی ہوئی امید اور اس کے ساتھ ہی موت کا خوف اور مایوسی کا تسلط بھی ہوتا یوں معلوم ہوتا تھا گویا یہ لوگ ان باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات کہہ ہی نہیں سکتے وہ لیٹے لیٹے جب نا امیدی کے خوف سے گھبراتے ہیں تو اپنے ہی وسوسوں کو دبانے اور ان سے نجات پانے کے لئے، زور زور سے چلاّ کر خدا کے رحم کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔

شروع میں ہم لوگوں کی گفتگو کا موضوع یہی لوگ تھے۔ہم سوچتے کہ ان میں اکثر ایسے ہوں گے جنہوں نے واقعی قتل کئے ہوں گے، ایسے بھی ہوں گے جو بے گناہ پکڑے گئے کیونکہ قانون اور انصاف کا جو معیار ہمارے ہاں موجود ہے اس میں ہر قسم کے امکانات ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہر آدمی محسوس کرتا تھا کہ انسان کا یہ حشر بڑا ہی ذلت آمیز، بڑا ہی دردناک اور ناقابل برداشت ہے۔

معمولات

دو چار روز کے بعد ہم نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔

زندگی پھر ایک معمول پر آگئی۔ پھر یہ معلوم ہونے لگا گویا ہم ہمیشہ سے اسی جگہ پر اسی طرح رہ رہے ہیں۔ ندیم کی کوٹھڑی میں ہم لوگ صبح سویرے کمبل بچھا کر تاش کھیلنے بیٹھتے تو پھر شام ہی کو اُٹھتے۔ تاش کے نمبر کوئلہ سے دیوار پہ لکھتے لکھتے دیوار کی حالت اس قسم کی کر دی گئی کہ اصل دیوار نظر ہی نہ آتی تھی۔ دن بھر تاش بازی، لطیفہ بازی، اور چٹکلہ بازی ہوتی رہتی۔ اس بظاہر مطمئن زندگی میں ہم لوگوں کو باہر چھوڑے ہوئے لوگوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کی یاد زیادہ ستاتی جو اسی جیل میں موجود تھے مگر ہم سے علیحدہ تھے۔ ایک جیل میں اتنی جیلیں ہوتی ہیں، اس کا تجربہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ افضل، شوکت منٹو اور بعض دوسرے رفیق ہماری بیرک سے زیادہ سے زیادہ پچاس گز کے فاصلے پر تھے مگر راستے میں دیواروں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ہم اپنے احاطہ سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی طرح وہ بھی ہمارے پاس نہیں آسکتے تھے۔ دادا منصور اور ظہیر ہسپتال میں تھے۔ ہسپتال بھی ہم سے چند قدم کے فاصلہ پہ تھا مگر راستے میں مٹی، آئین اور قانون کی دیواریں حائل تھیں، ایک پابندی کے ساتھ ہزار پابندیاں اور ایسی تھیں جن کا احساس ہی تکلیف دہ تھا۔ ہنستے ہنستے جب گفتگو کے دوران میں ان دوستوں کا ذکر آجاتا تو ہم سب کے چہروں پر مردنی سی طاری ہو جاتی۔

اس زمانہ میں سب سے زیادہ انتظار ملاقات کا رہتا تھا۔ پندرہ روز کے بعد جمعرات کو ملاقات کا دن آتا تو ہمارے اداس احاطے اور ویران زندگی کے

آنگن میں بہار آجاتی - باہر کی پیاری اور خوبصورت دنیا سے آنے والے عزیز قیدیوں کے لئے کیسی بہاریں، کیسی خوشبوئیں اور خوشیاں لاتے ہیں - اس کا اندازہ کچھ قیدی ہی کو ہوتا ہے -

ملاقات کے دن ملاقات کے منتظر لوگ صبح اُٹھ کر شیو کرتے، نہاتے اور پھر بلاوے کا انتظار کرتے بیٹھے رہتے - یہاں پر ہمارے ساتھ ہیلا رام کاٹن ملز یونین کے صدر اور سیکرٹری نسیم اور صدیق بھی رکھے گئے تھے - وہ ہم لوگوں کے گرفتار ہونے سے مہینہ بھر پہلے گرفتار ہو کر آ گئے تھے - ان میں سے صرف صدیق کی ملاقات ہوتی تھی - ہم میں سے رشید اور میں ملاقات کرنے جاتے کیونکہ ندیم اور غلام محمد کے عزیز لاہور میں نہیں تھے -

چودہ نمبر بیرک میں آنے کے چند روز بعد رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا - صدیق اور نسیم دونوں باقاعدہ روزہ رکھتے تھے لیکن روٹیاں سب کو رات کے دو بجے ہی مل جاتی تھیں - جس کا جی چاہے رات کو کھالے، جس کا جی چاہے صبح یا اگلے روز دوپہر کو کھالے - دوپہر تک رکھے رہنے کے بعد اگرچہ یہ روٹیاں اس قدر سوکھ جاتیں کہ کھانے کے قابل نہ رہتیں مگر ہم لوگ مجبوراً اپنے حصے کی دو دو روٹیاں رات کو دو بجے لے لیتے اور اگلے دن دوپہر کو کھاتے -

کھانے اور چائے کا انچارج یہاں پر بھی غلام محمد تھا - غلام محمد کسان ہے اور کسان کی وسیع القلبی اس میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے - وہ کھانا بنانے

میں سارا کام خود کرتا۔ پھر سب کو حصے کے مطابق دیتا۔ سب کی ضروریات اور عادات تک کا خیال رکھتا۔ اس کو معلوم ہوا کہ مجھے صبح سویرے اٹھتے ہی چائے نہ ملے تو میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ صبح کو سب سے پہلے اٹھتا۔ چائے بناتا۔ پھر چائے کی کیتلی لے کر میرے بستر پر آ کر بیٹھتا اور آواز دیتا "اٹھو بھئی حمید اختر! چائے تیار ہے" جب تک وہ ساتھ رہا اس کا یہی معمول رہا۔ کھانا ہم لوگ ہمیشہ ندیم کی کوٹھڑی میں کھاتے تھے۔ شام کی چائے بھی وہیں پیتے لیکن صبح کی چائے کے لئے غلام محمد ہمیشہ میرے کمبل پر پہنچ جاتا اور سب کو اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہیں آنا پڑتا۔ سگریٹ ہم لوگ ندیم کے پاس جمع کر دیتے اور راشن کے مطابق ان سے وصول کر کے پیتے تھے۔ سب سے بڑی مصیبت کپڑے دھونے کی تھی۔ مجھے کپڑے دھونے کے فن سے ذرا سی بھی واقفیت نہ تھی۔ بہت دفعہ کوشش کی مگر کپڑے کی میل کسی طرح کپڑے کا پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس معاملہ میں بھی ندیم نے حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا۔ وہ کپڑوں کا ڈھیر لگا کر باقاعدہ چھوا چھو کرتے اور پلک جھپکتے میں دھلے ہوئے کپڑے دیواروں پر لٹکتے نظر آتے۔ اس سلسلہ میں میں نے ان کی باقاعدہ شاگردی بھی کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا —— بلکہ بعض اوقات جب شاگرد کپڑوں میں الجھا ہوتا تو استاد آ کر اس کو اس مصیبت سے بچاتا۔

ایک آواز

چند دن گزر گئے۔ ایک روز پھانسی کی کوٹھڑیوں سے ایک عجیب درد بھری آواز سنائی دی۔ اس آواز کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ گانے والا کیا کہہ رہا ہے، یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ بس ایک درد تھا جو آواز کے ساتھ ہی چاروں طرف جیسے بکھر سا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ آواز پھر سنائی دی۔ اس کے بعد تو صبح شام دوپہر، ہر وقت یہ نغمہ گونجتا۔ یہ آواز اتنی بلند، اتنی پُر اسرار اور درد بھری ہوتی تھی کہ اسے سنتے ہی ہم لوگ اپنی گفتگو بند کر دیتے۔ کھانا کھانے کے دوران میں آواز سنائی دیتی تو ہمارے چلتے ہوئے ہاتھ رک جاتے۔ اس کا جادو اتنا عجیب، اس قدر غمگین اور پُر اسرار تھا کہ یہ بلند آواز جہاں تک پہنچتی سنّاٹا طاری ہو جاتا۔ خاموشی چھا جاتی۔

چند روز کے بعد پوچھ گچھ کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ گانے والا جھنگ کے ضلع کا ایک نوجوان ہے جس کی تمام اپیلیں مسترد ہو چکی ہیں اور جو موت کے دروازہ پر کھڑا صرف مقررہ تاریخ کا انتظار کر رہا ہے۔ اس پس منظر میں اس کی آواز اور بھی ڈراؤنی اور دردناک معلوم ہونے لگی۔ وہ ایک ہی ٹپہ گاتا تھا ؎

عیلی عیلی نام سوہنا سوہنے پیر دا ای

باہو بوٹا سخیا ویلا بھیڑ دا ای

موت کے دروازہ پہ پہنچ کر انسان میں کتنا غنا، کتنا سوز اور کتنا درد پیدا ہو

جاتا ہے یہ اندازہ شیرے کی آواز سُن کر کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا درد کا ایک اُبلتا ہوا چشمہ ہے جو اس کے اندر سے اپنے آپ نکل رہا ہے

کھانا ہم اب بھی شام کے پانچ بجے ہی کھا لیتے کیونکہ ہمیں لنگر سے جو روٹیاں ملتی تھیں وہ تھوڑی دیر بھی رکھے رہنے کے قابل نہ ہوتی تھیں۔ پھر اگرچہ ہم لوگ باہر سوتے تھے لیکن غروبِ آفتاب کے بعد ہمیں اپنی اپنی جگہ سے ہلنے یا گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ اسے ہضم کرنے کے لئے تھوڑی دیر ٹہلتے ضرور تھے۔ ندیم ٹہلنے کے معاملہ میں ہمیشہ اعتراض کرتے تھے۔ ایک روز میں نے ان کو پورا لیکچر دے کر ٹہلنے اور کھانا ہضم کرنے کے فلسفہ کا قائل کیا اور شام کو کھانے کے بعد انہیں گھسیٹ کر اپنے ساتھ ٹہلنے پر مجبور کر دیا مگر احاطہ کا ایک ہی چکّر لگانے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ندیم صاحب کمبل پہ بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے "مونگ کی دال ہضم کرنے کے لئے بس ایک ہی چکّر کافی ہے۔"

ایک شام ہم دونوں تیز تیز قدموں سے احاطہ کا چکّر لگا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ میں نے ان سے کہا "میرے والد کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور میری پرورش میرے تاؤ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔"

"اچھا!" ندیم نے کہا "میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میرے چچا جو میرے نگران تھے، انگریزی طرز کے بال نہیں رکھنے دیتے تھے۔ اور ہم اگر کبھی بال بڑھا کر

کٹوا لیتے تو ان کے سامنے بالوں کو تولیہ میں چھپا کر جایا کرتے تھے"

"ارے!" میں نے تقریباً چیخ کر کہا "میرے تایا بھی بالکل یہی کرتے تھے۔ بلکہ انہیں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ خاندان میں سے کسی نوجوان نے انگریزی طرز کے بال رکھ لئے ہیں تو وہ حجام کو بلا کر زبردستی بال کٹوا دیتے۔ زبردستی نہ ہو سکتی تو سوتے میں کٹوا دیتے"

تھوڑی دیر تک ٹہلنے کے بعد میں نے کہا "میرے تایا بڑے نیک آدمی تھے۔ دن بھر تسبیح ہاتھ میں لئے دیوان خانہ کے باغیچہ میں ٹہلتے رہتے تھے اور رات رات بھر نفل پڑھتے تھے"

ندیم نے حیرت سے چیختے ہوئے کہا "ارے بھئی میرے چچا بھی بالکل اسی قسم کے نیک بزرگ تھے"

"حیرت ہے" میں نے کہا "میرے تایا نے شیرازی کبوتر پال رکھے تھے اور بندریا بھی رکھی ہوئی تھی جس کا نام "بدھال" تھا"

"بھئی حد ہو گئی" ندیم نے کہا "میرے چچا نے بھی ایک بندریا پال رکھی تھی، اس کا نام بھی کچھ اسی قسم کا تھا"

ان انکشافات کے بعد ہم لوگ دل کھول کر ہنسے۔ ہم نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور گلے بھی ملے اور دیر تک ہنستے رہے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں ڈبی چودہ نمبر برک میں عید کی آمد کا پتہ بھی چلا۔ ہم نے

جیل کے افسروں سے بار بار درخواست کی کہ عید کے روز ہم نظر بندوں کو ایک ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے، ہم دوسرے قیدیوں سے نہیں مل سکتے تو کم از کم عید کے دن ہمیں افضل اور شوکت منٹو وغیرہ کے ساتھ عید تو پڑھ لینے دیجئے۔ جب یہ درخواست نامنظور ہوئی تو ہم نے یہ بھی کہا کہ ہمیں دوسرے عام قیدیوں کے ساتھ مل کر عید کی نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے لیکن اس کی منظوری بھی نہیں ملی۔ اور عید کے دن جب ہماری اسلامی مملکت کی اس جیل کے تمام خلاقی مجرم ایک مولوی صاحب کے پیچھے ایک جگہ جمع ہو کر نماز پڑھ رہے تھے، گلے مل رہے تھے۔ ہم ادیب اور شاعر جو کسی جرم میں نہیں آئے تھے، پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے پیچھے کمبل بچھائے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس کس مپرسی میں اپنے علاوہ ہر آدمی اپنے ان عزیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو جیل سے باہر گھروں کی چار دیواریوں میں اسی طرح بیٹھے ہمیں یاد کر رہے ہوں گے۔

بیس یا بائیس جون کی شام کو جیل کے دفتر سے ایک نمبر دار ایک چٹ لیکر آیا۔ یہ چٹ خاص جیل کی زبان میں لکھی ہوئی تھی۔ لکھا تھا "احمد ندیم قاسمی کو اے کلاس میں شمار کریں اور اسے بی کلاس کا کھانا اور چارپائی وغیرہ دی جائے"

یہ تو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اے کلاس دے کر بی کلاس کا کھانا

دینے کی ہدایات کیا معنی رکھتی تھیں، بہر حال ندیم کو اے کلاس ملنے کی ہم سب کو خوشی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خطرہ بھی تھا کہ ان کو ہم سے الگ کر کے افضل اور منٹو اور دوسرے بی کلاس والوں کے ساتھ نہ بھیج دیا جائے۔

اگلی صبح ندیم کے لئے بی کلاس والوں کے لنگر سے چائے آئی، دوپہر کو پکا ہوا گوشت اور توے کی چپاتیاں بھی آگئیں۔ گوشت چکھے ہوئے ایک مدت گذر چکی تھی اس لئے سب نے تھوڑا تھوڑا گوشت چکھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ شام کو چارپائی بھی آگئی جو چارپائی کم اور جھولا زیادہ تھی۔ بستر بچھا کر جب ندیم اس پر لیٹنے کی لڑائی کرنے لگے تو ان کی کمر زمین تک پہنچ گئی مگر وہ اس قدر خوش تھے کہ پہلی رات خوشی کے مارے ان کو نیند نہیں آئی۔ رات بھر پکارتے رہے کہ "دیکھ رہے ہیں آپ لوگ میں آج چارپائی پر لیٹ رہا ہوں —"

دو دن کے بعد وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ شام کو چیف ہیڈ وارڈر نے آکر کہا "چلو بھئی بی کلاسیا کون ہے! اپنا سامان باندھ کر بی کلاس والوں کے ساتھ چل کر رہنے کی تیاری کرو"

جیل کی اس ڈیڑھ دو ماہ کی زندگی میں میرے لئے غالباً یہ سب سے بڑا صدمہ تھا۔ ندیم اگرچہ بہتر جگہ پر جا رہے تھے لیکن کمپنی چھوٹ جانے کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی زیادہ پریشان تھے۔ اس سارے عرصے میں ندیم، غلام محمد اور میں ہر وقت ساتھ رہے تھے۔ ہماری طبیعتیں بھی بہت ملتی تھیں اس لئے ہم نے

یہ عرصہ بہت اچھی طرح سے گزارا تھا۔ مگر اس مجبوری میں کوئی بھی کچھ نہ کر سکتا تھا اس لئے ہم نے ندیم کو رخصت کیا۔ اگلے روز کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا کہ شمیم اشرف ملک کو بھی کلاس مل گئی ہے اور وہ بھی ندیم وغیرہ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ہے۔

اسی شام دادا منصور اور ظہیر کاشمیری ہسپتال سے منتقل ہو کر ہمارے ساتھ آ گئے جس سے ندیم کے جانے کا غم کچھ کم ہوا لیکن ان کے جانے کے بعد تاش کھیلنے کا مزا تو بالکل جاتا رہا۔ ظہیر اور دادا ہسپتال میں ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ رہ کر واپس آئے تھے مگر انہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ علاج کرانے کے لئے نہیں بلکہ مزید بیماری مول لینے کے لئے ہسپتال بھیجے گئے تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے اور دونوں ہی بہت کمزور دکھائی دیتے تھے

رخصت اے ہمسفرو

جولائی کا مہینہ سخت گرمی کا تھا مگر ہم نے گرمی برداشت کرنے کی عادت ڈال لی تھی اور کسی نہ کسی طرح وقت پورا کر رہے تھے، کبھی کبھی ہم "پسماندگان" بیٹھ کر ندیم، افضل اور شمیم کی باتیں کرتے۔ وہ لوگ ہم سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی کتنے دور تھے۔ فاصلہ تو کچھ بھی نہ تھا، چالیس یا پچاس گز مگر ان کے اور ہمارے درمیان دیواروں، لوہے کے جنگلوں اور تالوں کا جال بچھا ہوا تھا۔

پابندیوں کی ایسی بھی بہت سی دیواریں تھیں جو دکھائی نہ دیتی تھیں مگر محسوس کی جا سکتی تھیں۔ ہم صرف حسرت بھری نظروں سے اس طرف دیکھتے اور شام کو ٹہلنے کے دوران میں بچوں کی طرح ادھر اشارے کرتے اور ان کا نام لے لے کر پکارتے۔

یہ صدمہ اور یہ اذیت ہی کچھ کم نہ تھی کہ ایک شام چیف وارڈر ڈیوڑھی سے ایک پرچی لے کر آ گیا جس پر لکھا تھا کہ دادا منصور اپنا سامان لے کر ڈیوڑھی پہنچ جائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ نظربندوں کو ان باتوں کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ انہیں اس طرح دنیا سے الگ کر کے رکھا جاتا ہے جیسے ان کا کبھی دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ دادا کی تشویشناک بیماری کی وجہ سے ان کی رہائی کا خیال بھی دل میں گزرا۔ شاہی قلعہ بھی نظر کے سامنے تھا اور کسی دوسری جیل میں تبادلہ کا خیال بھی ہو سکتا تھا مگر یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے بڑے تذبذب، پریشانی اور بھرے ہوئے دل کے ساتھ دادا کو رخصت کیا۔ ہمیں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟

اگلی شام ہم لوگ بیٹھے دادا کی جدائی اور ان کی قسمت کے بارے میں سوچ بچار کر ہی رہے تھے کہ وہی منحوس چیف وارڈر پھر نمودار ہوا۔ پرچی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس بار وہ غلام محمد کو بمعہ اس کے ٹرنک اور بستر کے ڈیوڑھی لے گیا غلام محمد کے جانے کے بعد تو ہماری طبیعت صاف ہو گئی کیونکہ چاٹے اور کھانا

پکانے میں اسی کو مہارت حاصل تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے آگ سلگانی پڑتی۔ کیونکہ ظہیر کاشمیری کو ان چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ دن بھر اپنی بیماری اور اس کے ذکر میں مست رہتا۔ میں چولھا جھونکتا اور چلّا چلّا کر کہتا "اوئے غلام محمدا توں کتھے گیاں ایں اوئے —— میں مر گیا"

یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم سب کو الگ الگ جیلوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے، اس لئے غلام محمد اور منصور کے جانے کے بعد ظہیر اور میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ملاقات کا انتظار بھی تھا۔ غلام محمد چودہ جولائی کو گیا تھا، ملاقات کی جمعرات ۱۹ جولائی کو پڑتی تھی۔ خدشہ یہ تھا کہ اگر ملاقات سے پہلے لاہور سے کسی اور ضلع کی جیل میں تبادلہ ہو گیا تو سگریٹ، گھی، چینی، دودھ اور دوسری ضروریات کا کیا ہوگا کیونکہ یہ تمام ایسی چیزیں تھیں جن کے بغیر گزارہ ہونا بالکل ناممکن تھا اور یہ چیزیں اب بالکل ختم ہو رہی تھیں۔ ملاقات پر ہی ان کے ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ تبادلہ ملاقات سے پہلے ہونے کی صورت میں میری حالت تو بہت بُری ہو سکتی تھی اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں تھا لاہور سے کوئی عزیز کتنے دنوں میں میرے پاس پہنچ سکیگا۔ یہ خیال بھی تھا کہ ملاقات لاہور ہی میں ہو جائے تاکہ اپنی بہن کو بھی اس امکانی خطرے سے آگاہ کر دوں ورنہ اسے سخت صدمہ ہو گا۔ اسی کشمکش میں پندرہ تاریخ گزر گئی۔ اس شام کسی کو لینے کے لئے ڈیوڑھی سے کوئی آدمی نہ آیا۔ سولہ اور سترہ تاریخ بھی گزر گئی۔ میں نے سوچا شاید مجھے لاہور ہی میں رہنے دیا جائے۔

۱۸ ار کی شام کو میں اگلے روز ہونے والی ملاقات کے تصور میں خوش بیٹھا تھا کہ موٹا چیف وارڈر پھر نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ آج کسی اور کی باری ہے وہ بھی سمجھ گیا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ پاس آ کر اس نے کہا "چلو بھئی حمید اختر کون ہے؟ سامان باندھو اور چلنے کی تیاری کرو"

ملاقات سے صرف ایک رات پہلے تبادلہ ہونے کی وجہ سے دل پر قیامت گزر گئی۔ کہاں یہ خیال تھا کہ صبح اپنی بہن اور عزیزوں سے ملوں گا۔ کچھ دنیا جہان کی باتیں معلوم ہوں گی، کچھ کھانے پینے کا سامان ملے گا۔ اور کہاں یہ نوبت پہنچی کہ اپنا سامان مشقتی کے سر پر اٹھوا کر ڈیوڑھی کی طرف چلنا پڑا۔ ایسی صورت میں کہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ منزل کونسی ہے اور کدھر جانا ہے۔

ڈیوڑھی پہنچا تو ایک تھانے دار اور دو سپاہی بمعہ اپنی رائفلوں کے پیشوائی کے لئے موجود تھے۔ تھانے دار نے میرے پوچھنے پر جب یہ بتایا کہ مجھے ملتان جیل میں بھیجا جا رہا ہے تو الف لیلہ کے شہزادے کی طرح میرے دل میں خوشی سے ہنسنے اور پھر دھاڑیں مار کر رونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ہنسنے کی خواہش اس وجہ سے ہوئی کہ میرے بچپن کا عزیز ترین اور مخلص دوست حبیب پاسلوی اور لدھیانہ کے دوسرے بہت سے دوست ملتان میں تھے اور رونا اس لئے چاہتا تھا کہ وہ سب لوگ اپنے گھروں میں ہوں گے اور میں اپنی جیل میں —— اور ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔

ایک تصویر

۱۵؍ جولائی کی یہ شام کیسی عجیب، کتنی سہانی اور کس قدر پُراسرار تھی! سنٹرل جیل لاہور کے پھاٹک سے نکل کر سٹیشن ویگن میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس شام کے سحر کو چاروں طرف بکھرا ہوا پایا۔ تھانے دار ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دونوں سپاہی رائفلیں تھام کر میرے بالکل سامنے بیٹھ گئے۔

تھانے دار نے کہا "آپ کو ہتھکڑی پہنائی جائے گی۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"جی نہیں!" میں نے جواب دیا "مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ عمر بھر آپ کا احسان مند رہوں گا"

میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

لوہے کی ایک زنجیر میرے ہاتھ کے گرد حلقہ بنانے لگی۔ مگر میں نہ تو اس زنجیر کو دیکھ رہا تھا اور نہ اس کی گرفت کو محسوس کر رہا تھا۔ میں تو اس سرسبز، حسین اور خوبصورت دنیا کو دیکھ رہا تھا جسے دو مہینہ سے بھوری دیواروں نے میری نظروں سے اوجھل کیا ہوا تھا اور اب یہ وسیع شاداب دنیا —— رائفلوں کے سائے ہی میں سہی، میری نظروں کے سامنے تھی۔

موٹر چلنے لگی تو تھانے دار نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی نے میری ہتھکڑی

کھول دی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو تھانے دار نے کہا "کوئی بات نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے ___"

موٹر چلی تو ایک سپاہی نے مجھ سے کہا "آپ قتل کے مقدمہ میں آئے ہیں؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

"کس کو قتل کر کے آئے ہو؟" دوسرے سپاہی نے کہا۔

"کسی کو نہیں، خود قتل ہو کر آیا ہوں"

سپاہی نے پہلے تو بڑا سا منہ کھولا اور پھر کہنے لگا "اوہ میں سمجھا تھا بازار میں کسی سے جھگڑا وگڑا ہوا ہوگا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آتا ہے"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہماری موٹر لارنس روڈ پر جا رہی تھی۔ داہنے ہاتھ لارنس باغ تھا۔ پھول تھے، شادابی تھی۔ بائیں ہاتھ پر بڑی بڑی کوٹھیاں اور ان میں رہنے والی مطمئن مخلوق تھی، ان راستوں سے میری کتنی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ ان راستوں کی خاک میں نے کتنی مرتبہ چھانی تھی۔ لیکن اس شان سے کبھی نہ آیا تھا جس شان سے اس وقت جا رہا تھا۔ میں بار بار لارنس باغ کو دیکھتا۔ دو مہینہ سے کوئی پھول، کوئی شگوفہ کوئی اچھی صورت نہ دیکھی تھی، صرف کھوری اور مکروہ دیواریں دیکھی تھیں اور اس وقت جولائی کی اس چمکیلی شام میں ہزاروں پھول میری نظروں کے سامنے کھلے ہوئے تھے۔ پھولوں کی بہار اپنے جوبن پر تھی۔ اور میں مجبوس تھا مگر خوش قسمتی سے

ابھی آنکھوں پر سیفٹی ایکٹ چلانے کا طریقہ دریافت نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے میری نظریں آزاد تھیں۔

لارنس روڈ ختم ہو گئی اور کوئنز روڈ کا چوک آ گیا۔ پھر موٹر آگے بڑھنے لگی۔ دل کا عجب حال تھا۔ بے چارگی کا احساس بھی تھا اور گھلاوٹ کا بھی، غم کی کسک بھی تھی اور خوشی کی لہر بھی۔

چلتے چلتے جب موٹر ریگل کے چوک میں پہنچی تو ایک دم سے جیسے میری ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ میری نظر کے سامنے مال کا چوک تھا۔ زندگی تھی، حرکت تھی، چہل پہل تھی۔ لوگ فرحاں و شاداں گزر رہے تھے۔ چیرنگ کراس کی طرف سے ایک بس آئی اور جی، پی، او کی طرف چلی گئی۔ بیڈن روڈ سے ایک مہوش سائیکل سوار چوک عبور کر کے ٹمپل روڈ کی طرف بڑھ گئی۔ تین چار برقعہ پوش لڑکیاں مال کا چوک عبور کر کے چیرنگ کراس کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے قدم بڑی نفاست اور نزاکت سے اٹھ رہے تھے اور ان کے سیاہ برقعے ہوا میں لرز رہے تھے۔ ان کی دراز جھکی ہوئی پلکیں اور ان کے قدم اٹھانے کا انداز مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ محرومی اور زندگی کی مسرتوں سے بیگانگی کے دو مہینے گزارنے کے بعد مجھے یہ سارا نقشہ بہت ہی زندہ اور جاندار معلوم ہوا۔ جیسے میری ساری حسیں بیدار ہو گئی تھیں اور میں ان ساری لطافتوں سے ہمکنار ہو رہا تھا جو عورت اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور جن سے میں محروم رہا تھا۔

دفعتہ" مجھے یوں محسوس ہوا گویا ریگل کا یہ چوک موت کے راستے پر زندگی کا آخری چوک ہے۔ اگر یہ سفر ایک بھوری دیوار سے نکل کر دوسری بھوری دیوار کے پیچھے جانے کے لئے نہ ہوتا۔ اگر مسرت اور لطافت کا یہ لمحہ ریگ زار میں نخلستان کی طرح اچانک میرے سامنے نہ آجاتا تو میں اسے فوراً فراموش کر دیتا۔ لیکن یہ منظر، یہ تصویر تو میرے ذہن پر ثبت ہو گئی تھی۔ موت کی تاریک وادیوں میں سے نکل کر ایک لمحہ کے لئے اس چوک میں زندگی، حسن، حرکت اور لطافتوں کو دیکھ کر میں جیسے بوکھلا رہا تھا۔ مگر موٹر اگلے ہی لمحہ اس چوک سے نکل کر ہال روڈ پر سے گزرنے لگی۔ ہال روڈ، پھر رتن چند روڈ، پاکستان ٹائمز کا دفتر، سرکلر روڈ سب کچھ گزر گیا اور روشنی سے پرے لاہور ریلوے سٹیشن کی عمارت نظر آئی۔ چاروں طرف روشنی تھی، نور تھا، شور تھا اور حرکت کرتی ہوئی زندگی کی اس لہر میں میں پا بجولاں اپنے محافظوں کے ساتھ سٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ دنیا کے کام اسی طرح چل رہے تھے، لوگ اسی طرح گھوم پھر رہے تھے مگر میں ایک قدم بھی اپنی مرضی سے نہ اٹھا سکتا تھا۔ میرے محافظ مجھے جدھر چلنے کا اشارہ کرتے میں اُدھر ہی چل پڑتا۔

ملتان جانیوالی گاڑی تیار تھی۔ میں دو ماہ سے زمین پر سونے کی مصیبت میں مبتلا تھا اسلئے گاڑی کی ایک سیٹ پر بستر بچھا کر جب میں اس پر لیٹا تو مجھے عجیب لذّت کا احساس ہوا اور میں فوراً ہی سو گیا۔

اگلی صبح — چھ بجے میں سپاہیوں کی حفاظت میں ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے آہنی پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا۔

ڈسٹرکٹ جیل ملتان

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے آہنی پھاٹک کے سامنے میری سواری ایک تھانیدار اور دو مسلح سپاہیوں کے ہمراہ صبح چھ بجے سے بھی پہلے پہنچ گئی تھی۔ ملتان چھاؤنی کے سٹیشن سے لے کر اس آہنی پھاٹک تک راستہ بھر فضا کچھ سوئی سوئی سی نظر آتی تھی۔ راستے خاموش تھے۔ سڑکیں جیسے اجنبی مسافروں کے انتظار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی تھیں۔ ہر طرف خاموشی اور سکوت کا راج تھا اور جولائی کی یہ صبح بڑی روشن، بڑی اُجلی اور خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔

مجھے خاص طور پر اس لئے بھی کہ دو ڈھائی ماہ کی مکمل قفس نشینی کے بعد اس وقت میں اپنے آپ کو تھوڑا سا آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ پہرے دار اور رائفلوں کی موجودگی اور ان کے حکم کے بالکل مطابق حرکت کرتے رہنے سے آزادی کا یہ تھوڑا سا احساس بھی مجروح ہوئے بغیر تو نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی کچھ اطمینان اور سکون سا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ ہی اس نئی، موہوم اور ان دیکھی دنیا کے خطرے بھی دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ دوستوں کی جدائی، عزیزوں اور گھر والوں سے دوری اور نئے لوگوں کے متعلق لاعلمی کی وجہ سے میری حالت بالکل ویسی ہو رہی تھی جیسے کوئی اجنبی بالکل نئی جگہ پر پہنچ کر پہلے ہی دن محسوس کرتا ہے۔

اس جیل کا پھاٹک لاہور سنٹرل جیل کے پھاٹک کے مقابلہ میں بالکل حقیر سا لگ رہا تھا۔ یہ جیل شہر ملتان سے باہر تقریباً جنگل میں بنائی گئی تھی۔ ڈسٹرکٹ جیل ہونے کی وجہ سے اس کی دیواروں اور اس کی عمارت میں وہ شان و شوکت نظر نہیں آ رہی تھی جو لاہور کی جیل میں تھی۔ مگر جنگل میں ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ پُراسرار اور ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ نشتر میڈیکل کالج کی تعمیر شروع ہونے کی وجہ سے جیل کے آس پاس کچھ رونق ہو رہی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ میں اس سناٹے اور ڈراؤنے پن سے گھبرا گیا ہوتا۔

پھاٹک کے سامنے ایک سنتری رائفل کندھے پر اٹھائے اونگھتا ہوا گھوم رہا تھا۔ ہمارے تھانے دار نے اس کے پاس جا کر اس سے پوچھا کہ جیل کا دفتر

کتنے بجے کھلتا ہے؟"

سپاہی نے پہلے تو اپنا منہ کھولا۔ پھر قدم آگے بڑھا کر جواب دیا۔ "دفتر اس وقت کھل جاتا ہے مگر آج ڈپٹی صاحب نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا سامان ان کے بنگلے میں رکھوانے گئے ہیں اس لئے اب تک نہیں آئے۔ آتے ہی ہوں گے۔ ان کے آنے پر دفتر کا کام باقاعدہ شروع ہو گا" ایک لمحہ رُکنے کے بعد اس نے جیسے اپنے فقرے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "ملزم وغیرہ تو ان کے آنے پر ہی لئے جاتے ہیں"

اپنی بات ختم کرنے کے بعد سنتری نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ میرے ہتھکڑی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اور بھی گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جب اس سے نہیں رہا گیا تو اس نے بالآخر تھانیدار سے پوچھ ہی لیا "آپ کس کام سے آئے ہیں؟"

"یہ سیاسی نظر بند ہیں، ان کو چھوڑنے کے لئے آیا ہوں" تھانیدار نے کہا۔

"سیاسی نظر بند؟" سنتری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے بڑی گھبراہٹ اور چُستی کے عالم میں رائفل کندھے پر رکھ کر تیزی سے گھومنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ حقیقت بعد میں معلوم ہوئی کہ چھوٹی جیلوں میں سیاسی نظر بند کو بہت بڑی ہستی سمجھا جاتا ہے۔

تھانیدار نے موقعہ پاکر اس سے کہا "اگر دروازہ کھلوادو تو ہم لوگ کم از کم اندر جاکر دفتر میں بیٹھ جائیں"

اتنے میں ایک تنومند شخص (جو شخص کم اور تنومند زیادہ نظر آتا تھا) پتلون کے ساتھ ململ کا کرتہ اور سر پر کلف بھر طرّہ والی پگڑی رکھے ہاتھ میں ہنٹر لئے جیل کے دروازے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر جو پہلا خیال میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ اگر یہ خونخوار شخص ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہے تو یہاں پر خیریت نہیں ہے۔ اس کا جسم، اس کا طرّہ، اس کا تن و توش، اس کی تلّے دار جوتی سب اس قسم کی چیزیں تھیں جن سے جبر کی بُو آتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی رئیس زادہ ہے جس نے شکار اور عیاشی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ وہ ایسا جاگیردار معلوم ہوتا تھا جو اپنے مزارعوں کے خون کا پیاسا اور ان پر ظلم کرنے میں ماہر ہوگا۔ اس کے سارے جسم، وجود اور چہرے پر صرف ایک چیز ایسی تھی جس سے نفاست اور پاکیزگی کی جھلک رہی تھی اور وہ تھی اس کی سنہری فریم کی خوبصورت عینک، لیکن یہ عینک اس چہرے پر آکر جیسے اپنی حیثیت کھو بیٹھی تھی۔

اس کے آنے پر سنتری نے اسے سلیوٹ کیا۔ جیل کا پھاٹک کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے نظر بھر کر ہمیں دیکھا مگر کچھ کہے سُنے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گھبراہٹ میں سنتری سے پوچھا "کیا یہی ہیں ڈپٹی صاحب؟"

"نہیں یہ تو فیکٹری انچارج ہیں، راجہ صاحب!"

سنتری کے منہ سے یہ فقرہ سُن کر میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا کہ چلو یہ شخص کوئی بھی ہو کم از کم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تو نہیں ہے جیل میں اگرچہ ساری طاقت سپرنٹنڈنٹ ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن بظاہر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہی سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔ پھر لاہور میں چودھری احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ دیکھ کر تو میں زیادہ ہی ڈرا ہوا تھا۔

تھانیدار کے کہنے پر سنتری نے پھاٹک کے اندر والے سنتری سے کچھ کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جیل کا پھاٹک ہمارے لئے کھل گیا۔ سب سے پہلے تھانے دار صاحب اندر داخل ہوئے، پھر میں اور اس کے بعد دونوں سپاہی بھی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ بالکل ویسی ہی ڈیوڑھی تھی جیسی لاہور سنٹرل جیل کی، اسی طرح کا بغلی کمرہ تھا جس پر "ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ" کا بالکل ویسا ہی بورڈ لٹک رہا تھا، وہی نحوست اور تصنّع کی فضا تھی اور وہی تالے اور وہی چابیوں کے گچھے لٹک رہے تھے لاہور سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی اور ملتان ڈسٹرکٹ جیل کی ڈیوڑھی میں صرف سائز کا فرق تھا ورنہ اتنی یگانگت تھی کہ مجھے لمحہ بھر کے لئے ایسا محسوس ہوا گویا میں سفر سے گھر واپس آ کر بیٹھا ہوں۔

ڈپٹی صاحب کے کمرے میں صرف ان کی کرسی سلامت تھی باقی سب کی سب ٹوٹی ہوئی تھیں چنانچہ ہم لوگ اپنی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ سب سے پہلے وہی فیکٹری انچارج نمودار ہوئے۔ اب کی بار انہوں نے

خاموشی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اندر آتے ہی تھانیدار سے پوچھا "کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں آپ لوگ؟"

ان حضرت کے منہ سے یہ مہذبانہ الفاظ سُن کر میں پہلے تو چونکا۔ ویسے تو ان کی شکل میں خونخواری کی کوئی بات نہیں تھی۔ یوں بھی ان کے نقش بُرے نہیں تھے۔ دیکھنے میں ان کو وجیہہ کہا جا سکتا تھا مگر جانے کیا چیز تھی جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ یہ آدمی بہت ظالم ہے۔ اس میں ان جابر جاگیرداروں کی خصوصیات ہیں جو اپنے غلاموں کو کتوں سے پھڑوا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کی چال ڈھال، ان کی وہ خوبصورت جوتی، ان کا ڈنڈا اور طرّہ جن چیزوں کا مطالبہ کرتا تھا وہ نہ تو ان کی آواز میں تھا اور نہ ان کے لہجے میں، چنانچہ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ آواز اسی آدمی کی ہے یا کسی اور کی؟

تھانیدار نے مختصر الفاظ میں اسے میرے سیاسی نظربند ہونے کے متعلق بتلایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ "آپ لوگ جلدی سے ان کو اپنی تحویل میں لے کر ان کو چھٹی دیں تو بڑی عنایت ہوگی ـــــــ"

"GOOD" فیکٹری انچارج صاحب نے کہا "تو آپ سیاسی نظربند ہیں، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" پھر انہوں نے تھانیدار صاحب کی طرف گھومتے ہوئے کہا "ہمارے ڈپٹی صاحب آج نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا سامان رکھوانے میں مصروف ہیں۔ بس ان کو تو وہی اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔

وہی آپ کو چھٹی دیں گے۔ کیونکہ سیاسی نظر بندوں کو وصول کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے، بس کچھ دیر اور ٹھہریئے " یہ کہتے اور مسکراتے ہوئے وہ حضرت رخصت ہو گئے اور میں ان کے سنگین جسم اور ان کی نازک عینک، ان کی پُر شکوہ طرّہ دار پگڑی اور بے نام معصومانہ مسکراہٹ پر غور ہی کرتا رہ گیا۔ تاہم ان سے خوف کرنے کی کچھ نہ کچھ بات دل میں محسوس ضرور کر رہا تھا۔

سات بج گئے، ساڑھے سات اور پھر آٹھ بج گئے۔ ہم لوگ جمائیاں لیتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ڈپٹی صاحب کے انتظار میں گھڑیاں گنتے رہے ڈیوڑھی کی ایک سلاخدار کھڑکی میں سے جیل کا اندرونی حصہ نظر آرہا تھا۔ وہی چارخانہ لباس پہنے بہت سے قیدی ادھر اُدھر اپنی اپنی مشقت میں مصروف نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی بیڑیوں کی جھنکار بھی سنائی دیتی۔ پھر کبھی لوہے کی سلاخوں اور تالوں اور چابیوں کی منحوس آواز بھی سنائی دیتی۔ کبھی اس کھڑکی کے سامنے کوئی سپاہی یا کوئی حوالدار خاکی وردی میں ملبوس گزر جاتا۔ یکایک مجھے یہ سارا منظر ایک کھیل، ایک نقشہ اور ایک عجیب مضحکہ خیز سی چیز معلوم ہونے لگا۔ جولائی کی اس اُجلی صبح کو ڈیوڑھی میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں نے کئی بار سوچا کہ میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں؟ یہ سب لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کونسی جگہ ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ اسی دنیا میں جہاں ہم سب رہتے آئے ہیں اور رہ رہے ہیں ہم ایک چار دیواری کھڑی کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے باہر

ایک ڈیوڑھی بنا کر ایک آہنی پھاٹک تعمیر کرتے ہیں اور پھر چند انسانوں کو اس چار دیواری میں بند کر کے ان پر سپاہی، حوالدار اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دیتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ مجھے بہت ہی عجیب و غریب معلوم ہوا۔ اور میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ وہ کون سا پہلا انسان تھا جس نے یہ سوچا ہوگا کہ انسانوں کو اس طرح بند بھی کیا جا سکتا ہے۔ سزا اور جزا کا آخرت کا جو تصور تھا اس کو اس دنیا داری کے طریقہ میں ڈھالنے کا خیال سب سے پہلے کس کے دل میں پیدا ہوا تھا؟ بار بار مجھے یہ سب کچھ ایک کھیل، ایک تصنع اور جھوٹی چیز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی محرومی کی ایک خلش اور اجنبیت کا احساس بھی شامل تھا۔ اپنی شعر و نغمہ اور حسن کی دنیا چھوڑ کر اس سنگدل اور بے مہر دنیا میں آنے سے جو روحانی تشنگی محسوس ہو رہی تھی وہ اس سارے پس منظر میں اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو گئی۔

کوئی سوا آٹھ بجے کے بعد پھاٹک کھلا اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا ایک شخص خاکی وردی میں ملبوس سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس وردی کی وجہ سے ہمیں یہ فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ شخص ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے میں تو خیر کرسی پر آرام سے بیٹھا تھا اور جانتا تھا کہ سی کلاس میں ہونے کی وجہ سے اندر جا کر زمین پر ہی ڈیرا جمانا پڑے گا مگر تھانے دار اور سپاہیوں کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ اس بوجھ کو اپنے کندھوں سے اتار کر فوراً بھاگنا چاہتے تھے

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے پھاٹک سے لے کر ہم تک پہنچنے کے دوران میں کوئی تین آدمیوں کو ٹوکا۔ چلنے کا انداز بھی کافی افسرانہ تھا اور چہرے پر خشونت کے آثار بھی تھے مگر میں نے دیکھتے ہی یہ اندازہ کر لیا تھا کہ یہ سب تصنع ہے۔ دراصل یہ آدمی وہ نہیں ہے جو یہ نظر آ رہا ہے یا جس طرح نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کرسی پر بیٹھ کر ڈپٹی صاحب نے بالکل کاروباری انداز میں تھانیدار سے پوچھا "کاغذات لائیے"

کاغذات کا مطالعہ کرنے کے دوران میں ان کے سخت سُرخ چہرے اور ماتھے پر کچھ ناپسندیدگی کے آثار بھی نمودار ہوئے۔ ان کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ قد چھوٹا اور سر گنجا تھا۔ وہ کرسی پر بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرسی پر بیٹھ کر ان کو اطمینان نہیں ہے۔ بس چلے تو ابھی بھاگ جائیں گے۔

کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"آپ کا نام؟"

"حمید اختر!"

"لاہور میں ڈھائی مہینے رہے؟"

"جی!" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس سیاسی نظربندوں کے رکھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے لیکن تم سی کلاس میں ہو اس لئے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے ـــــ مگر تم لاہور سے آئے ہو، لاہور کا جیل تو ایک سمندر ہے۔ وہاں بہت سے قیدی ہیں۔ سیاسی قیدی بھی بہت ہیں۔ مگر تم کو معلوم ہوگا کہ یہ جیل اس سے مختلف ہے۔"

ایک منٹ کے لئے اپنی تقریر روک کر انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"پہلے تم سمندر میں تھے۔ اب صرف ایک قطرہ ہو اور وہ بھی گرم توے پر ـــ اس لئے تم خود ـــــ سوچ سمجھ لو"

میری سمجھ میں ان کی یہ بے ربط تقریر بالکل نہیں آئی۔ تاہم بعض بزرگ قیدیوں سے یہ سُن رکھا تھا کہ جیل میں جانے پر سب سے پہلے جیل کے افسر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کا دبدبہ قائم رہے اس لئے میں یہ فوراً سمجھ گیا کہ ڈپٹی صاحب رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر مجھے اپنی سی کلاس کی اوقات اور اس کے حوالہ پر سخت غصہ بھی آ رہا تھا۔ میں نے ان سے صرف اتنا کہا "میں آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا لیکن میں نہ تو اپنے آپ کو ایک قطرہ سمجھنے کے لئے تیار ہوں اور نہ آپ کو گرم توا تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بہر حال مجھے تو وقت پورا کرنا ہے"

یہ فقرہ تو میں نے کہہ دیا مگر دل میں سوچ رہا تھا کہ لاہور جیل میں چودھری احمد خاں دو مہینہ رعب ڈالتے رہے اور ہم یہ سمجھتے رہے کہ رعب ڈال کر آخر

سیدھے راستے پر آ ہی جائیں گے اس لئے خاموش رہے۔ یہاں رعب ڈالنے کا سلسلہ نئے سرے سے شروع ہو گیا۔ نہ معلوم یہ اور کتنا عرصہ رہے؟

چینی کی تلاشی

ڈپٹی صاحب کا غذات کے مطالعہ سے فارغ ہو کر اپنے رجسٹروں میں کچھ اندراج کرنے لگے۔ ایک منشی کو اندر بھیج کر انہوں نے ایک ہیڈ وارڈر اور جیل کے چیف ہیڈ وارڈر کو طلب کیا اور انہیں میرے سامان کی تلاشی لینے کے لئے کہا۔

تلاشی کا سلسلہ اتنا ظالمانہ اور اس قدر ہتک آمیز تھا کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ اتفاق سے میں گرفتار ہونے سے لے کر اب تک اس بے عزتی سے بچا ہوا تھا۔ گھر سے مجھے اطمینان میں پکڑا گیا۔ لاہور جیل کی ڈیوڑھی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہماری جیبوں میں جو کچھ ہو وہ ہم جمع کرا دیں اندر صرف سگریٹ لیجا سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ چنانچہ ہم سب لوگوں نے اپنی اپنی جیبیں، خالی کر دیں۔ وہاں سے تبدیل ہو کر ملتان آتے وقت ڈیوڑھی میں میرے سامان کو ایک نظر دیکھا گیا تھا اور بس ـــــ لیکن یہاں پر تو ایک ایک چیز کو اس بری طرح دیکھا جا رہا تھا کہ خود مجھے شرم آنے لگی۔

ڈپٹی صاحب نے پہلے میرا بستر کھلوایا اور ایک ایک چادر کو اپنے سامنے

کھلوا کر دیکھا۔ پھر انھوں نے ٹرنک کھلوایا۔ سب سے پہلے چینی کا ایک تھیلا برآمد ہوا۔ انھوں نے فوراً حکم دیا "اوہو اتنی چینی! اسی کلاس کا نظربند اتنی چینی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔" پھر انھوں نے جمعدار سے کہا "چینی کی تلاشی لو!"

جمعدار نے ایک اخبار اپنے سامنے فرش پر پھیلایا۔ پھر اس پر ساری شکر انڈیل کر اس میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس نے اعلان کیا "چینی میں چینی کے سوا کچھ نہیں ہے"

پھر گھی کا ڈبہ نکلا۔ اسے بھی الٹ پلٹ کر دیکھا گیا مگر اس میں سے ایک چمچ کے علاوہ اور کچھ نہ نکلا۔ ایک بڑے ڈبے میں سگریٹ کے کوئی بیس پیکٹ دیکھ کر ڈپٹی صاحب چیخ اٹھے "اتنے سگریٹ؟ نہیں نہیں، اتنے سگریٹ تم ہرگز اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔"

میں جلا بیٹھا تھا مگر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا "حضرت لاہور سنٹرل جیل میں ہر ملاقات پر مجھے تیس پینتیس پیکٹ سگریٹ ملتے تھے اور کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ میرے خیال میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"

"لیکن ہم اجازت نہیں دے سکتے، رولز اس کی اجازت نہیں دیتے" ڈپٹی صاحب نے کہا۔

تھوڑی دیر اور تلاشی جاری رہی۔ اس کے بعد ٹرنک میں سے چائے پکانے کی کیتلی، لپٹن چائے کے دو پیکٹ، دودھ کے دو ڈبے اور دو چمچی، پیالی

اور چمچ وغیرہ برآمد ہوئے۔ ڈپٹی صاحب نے چیخ کر کہا "یہ چائے کا سامان؟ چائے اور سی کلاس میں؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!!"

میں نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ سی کلاس میں ہونے کے باوجود ہم لوگ لاہور جیل میں دو ماہ سے اپنی چائے پکاتے تھے۔ انہیں یہ بھی کہا کہ چائے میری ضرورت ہے مگر انہوں نے ہر بات تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ان کی گفتگو اور رویّہ سے مجھے یہ سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی کہ ہمیں کیوں لاہور جیل سے ایک ایک کر کے مختلف جیلوں میں بھیجا گیا ہے۔

ٹرنک اور بستر کی تلاشی سے فارغ ہو کر جمعداروں نے ڈپٹی صاحب کو سلیوٹ کیا۔

"نہیں ابھی ٹھہرو" انہوں نے کہا "جو کپڑے اس نے پہنے ہوئے ہیں ان کی تلاشی بھی تو لو—"

جمعداروں نے میری پتلون اور قمیص کی جیبوں، پتلون کے پائنچوں اور قمیص کے کفوں تک کو تلاش کر لیا۔ ان کا بس چلتا تو میرے اندر گھس کر بھی تلاشی لیتے یہی نہیں بلکہ پتلون قمیص کی تلاشی سے فارغ ہو کر انہوں نے مجھے جوتی اتارنے کے لئے کہا۔ اس تلاشی کی توقع مجھے ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اس امید پہ ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھا کہ وہ ان جمعداروں کو اس سے باز رکھیں گے لیکن ان کا چہرہ دھلی ہوئی سلیٹ کی طرح صاف تھا۔ اس پر کوئی تاثر، کوئی جذبہ نظر

نہیں آتا تھا سوائے حقارت کے اس جذبہ کے جو شروع میں ہر جیل افسر کے چہرے پر نظر آتا ہے۔

میں نے جوتی اتار ڈالی۔ جمعداروں نے اسے الٹ پلٹ کر اور اس کے تلووں کو ٹھونک بجا کر اچھی طرح دیکھ لیا۔ ظاہر ہے اس میں کچھ نہیں تھا میرے پاس بھی اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کے علاوہ کچھ نہیں تھا مگر گھنٹے بھر تک میری تلاشی جاری رہی۔ اگر یہ سلوک عام قیدیوں کا سا بھی تھا تب بھی انسانوں کے ساتھ یہ بڑا ہی شرمناک سلوک ہے۔ جب انسان، خواہ وہ کتنا ہی ظالم، لٹیرا اور بدمعاش کیوں نہ ہو، پابہ زنجیر ہو کر آتا ہے تو اس کا دل ایک معصوم بچے کی طرح نازک اور شفاف ہوتا ہے۔ وہ آبگینہ کی طرح ٹھیس لگنے سے ٹوٹ سکتا ہے۔ اس وقت اگر جیل کے افسر اپنی خونخواری چھوڑ کر ان سے انسانیت کا برتاؤ کریں تو مجھے یقین ہے کہ جرائم کی تعداد میں کافی کمی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ دل موم کی طرح قالب میں کیا جا سکتا ہے۔ اس نازک موقعہ پر بڑے سے بڑے مجرم کو نفسیاتی طریقوں سے، انسانی ہمدردی کے اصولوں سے اور محبت اور انسانیت کی مدد سے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ مجرم اور اس کا دل اس وقت موم کی طرح نرم ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا پیش پا افتادہ اور نہایت معمولی اصول ہے لیکن ہماری سرکاری مشینری کے یہ پرزے ایک ہی اصول پر چلتے ہیں۔ ان کے قدم اسی راستے پر اٹھتے ہیں جہاں انسانوں کو انسان نہیں بلکہ چور، ڈاکو اور

مجرم سمجھا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ وہ چور اور ڈاکو اور مجرم کیوں بنے۔

انہوں نے میرے بارے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو عام مجرموں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھ پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں ہوئی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ مجھے سیاسی طور پر خطرناک سمجھ کر بند کیا جا رہا ہے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں ادیب ہوں، ڈاکو نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں گنتی کے اصول یاد ہیں جو اس قسم کے ہیں کہ ہر نئے آنے والے قیدی سے ایسا سلوک کرو کہ اس پر تمہاری دہشت غالب آ جائے۔ اسے ڈراؤ دھمکاؤ اور رعب ڈالو۔ جس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک بار آنے والا قیدی اس جگہ پہنچ کر اور بھی ڈھیٹ، اور بھی بے شرم اور بے ایمان ہو کر نکلتا ہے۔ اور اس طرح یہ جیل مجرموں کو زیادہ پختہ مجرم بنانے میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے کہ ہماری سرکار پبلک فنڈ سے اتنی بڑی رقم خرچ کرتی ہے، تنخواہیں دیتی ہے، دیواریں کھڑی کرتی ہے اور لوہے کے جال بُنتی ہے۔ صرف اس لئے کہ معمولی انسانوں کو خوفناک مجرموں میں تبدیل کیا جائے۔

تلاشی وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈپٹی صاحب نے جمعداروں سے کہا "اس کی چائے کی کیتلی، چائے کی پتی، چینی، سگریٹ، ماچس اور غیر ضروری سامان اس بکس میں بند کر دو۔ ایک پاؤ چینی اور ایک ماچس اور سگریٹ کا ایک پیکٹ اس کو دے دو"

میں نے ذرا سختی سے کہا "جناب عالی میرے لئے ایک پیکٹ سگریٹ کافی نہیں ہے میں دن میں ایک پیکٹ سے زیادہ سگریٹ پیتا ہوں"

"اتنے سگریٹ مت پیا کرو!"

"کیوں رولز اجازت نہیں دیتے؟" میں نے کہا۔

ڈپٹی صاحب مسکرائے، مسکراتے وقت وہ ڈپٹی صاحب نہیں بلکہ پہلی بار انسان نظر آئے۔ میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "چائے کے بغیر مر جاؤں گا اور سگریٹ کے بغیر تو ——"

"دیکھو بھئی!" ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا "جب ختم ہو جائیں تو آدمی بھیج کر یہاں سے منگوا لینا۔ زیادہ سگریٹ قیدیوں کے پاس رہیں تو وہ جیل میں —— corruption پھیلا دیتے ہیں اور خرید و فروخت شروع کر دیتے ہیں مگر تم دو تین سگریٹ روز پیا کرو"

میں نے ان سے لاکھ کہا کہ سگریٹ میرے گھر سے آتے ہیں، میرے بہن بھائیوں نے پیٹ پہ پتھر باندھ کر میری ضرورت سمجھتے ہوئے یہ سگریٹ مجھے بھیجے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ میرے نزدیک اس سیاہ تاریک دنیا میں سگریٹ کی روشن چنگاری زندگی کی جوت کے برابر ہے۔ اور میرے لئے یہ رفیق ایسا رفیق ہے جو کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ یہ ایسا معشوق ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا بلکہ سینے کو جلا کر ہمیشہ ایک جلتی ہوئی ٹھنڈک پہنچاتا ہے —— مگر ڈپٹی صاحب کی

سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آیا اور چائے کے بارے میں تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ رولز اجازت ہی نہیں دیتے۔

میں نے کہا "وہاں لاہور میں ہمیں آٹا، لکڑی، مصالحہ، دال، سبزی وغیرہ مل جاتی تھی۔ ہم خود کھانا پکا لیا کرتے تھے۔ کیا اس کی اجازت یہاں ہو گی یا نہیں؟"

"سی کلاس میں کھانا پکانے کی اجازت نہیں ہے" انہوں نے کہا "اور پھر لاہور جیل تو سمندر ہے اور ـــــــ"

"یہاں میں گرم توے پر ہوں" میں نے ان کا فقرہ مکمل کر دیا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "گھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چینی لے جاؤ، ختم ہو جائے گی تو اور منگوا لینا۔ دودھ کے دونوں ڈبے لے جاؤ۔ خوب کھاؤ پیو، باقی چیزیں رہا ہو کر جاؤ گے تو مل جائیں گی۔ یہاں محفوظ پڑی رہیں گی فکر نہ کرو"

ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ کھانا پکانے کی اجازت نہیں ہے اور گھی دے رہے ہیں۔ جیل کی دال اور سبزی تیل میں پکی ہوئی ملے گی اور گھی کھانے کی اجازت دے کر مجھ پر کرم کیا جا رہا تھا۔ چینی اور دودھ کے ڈبے لے جانے کی اجازت بخش دی گئی مگر چائے کی پتی رکھ لی گئی۔ سگریٹ کا پیکٹ دے دیا گیا مگر ماچس کی اجازت دینے سے رولز نے انکار کر دیا۔ اللہ اکبر! کیا دنیا تھی، کیا رولز تھے۔ میں تو چکرا گیا۔ سگریٹ کیسے سلگاؤں گا، یہ پوچھنے تک کی جرأت بھی مجھ میں نہیں تھی۔ آخر میں نے کہا "جناب!

تیل میں پکی ہوئی دال اور سبزی تو میں ہرگز نہیں کھا سکوں گا۔ میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں آپ کو پہلے ہی کہے دیتا ہوں آپ جیل کے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کر لیجئے ———— بہرحال یہ مجبوری ہے کہ میں تیل میں پکی ہوئی چیزیں نہیں کھا سکتا ——"

"تو ٹھیک ہے" انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا "ہم لنگر والوں سے کہہ دیں گے، وہ سبزی اور دال تیل ڈالنے سے پہلے تمہارے لئے نکال لیا کریں گے تم گھی خود ڈال لیا کرنا معمولی بات ہے، اتنا تو ہم کر ہی سکتے ہیں" ڈپٹی صاحب نے بکمالِ شانِ بے نیازی یہ فقرہ اس طرح کہا گویا مجھے دونوں جہان کی دولت بخش رہے ہوں۔

میں نے پوچھا "گھی گرم کرنے کے لئے مجھے لکڑی ملے گی؟"

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں سی کلاس میں آگ جلانے کی اجازت تو قیدیوں کو دی ہی نہیں جا سکتی"

پھر انہوں نے گھبرا کر چیختے ہوئے جمعداروں سے کہا "جاؤ بھئی اس کو جلدی سے دوم تنہائی میں لے جاؤ۔ پانی کا ایک مٹکہ، ایک پیالہ، ایک چٹائی اور دری دے دینا اور ہاں درمیانی احاطہ میں بند کر کے باہر سے تالہ لگا دینا۔ اور اچھی طرح سے سُن لو کہ اس کے آس پاس کوئی قیدی، کوئی ملازم، کوئی آدمی پھٹکنا تک نہیں چاہیئے۔ یہ سیاسی نظر بند ہے، جاؤ لے جاؤ اس کو دوم تنہائی میں"

دوم تنہائی

دوم تنہائی کا نام دوم تنہائی کیوں رکھا گیا تھا، یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا دوم تنہائی کس طرح دوم تنہائی ہو سکتی ہے یہ بھی میں اس وقت نہ سمجھ سکا کیونکہ جس احاطہ میں میں پہنچا تھا وہاں تو اول و آخر تنہائی تھی، ویرانی تھی اور موت ہی موت نظر آتی تھی۔

جمعدار ڈیوڑھی سے چل کر سیدھے مجھے جیل کے درمیانی چکر میں لے آئے ہر جیل کے عین درمیان میں ایک چکر ہوتا ہے جو زندگی کے چکر سے بھی زیادہ پرہول اور پُراسرار ہوتا ہے۔ جیل کے تمام راستے، تمام قوانین، تمام کام اس چکر کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سارے قیدی، سارے جمعدار، سپاہی اور افسر اس چکر میں گھومتے رہتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مجھے بھی اسی چکر میں لایا گیا۔ جہاں میرا نام پتہ نوٹ کرنے کے بعد ایک اور آہنی پھاٹک میں سے گذار دیا گیا۔

چکر کے گرداگرد اس قسم کے کوئی سات آٹھ پھاٹک گول دائرے کی شکل میں تھے۔ ہر پھاٹک سے گذر کر جیل کے ایک مخصوص حصہ کو اس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ ان حصوں کو دیواریں ایک دوسرے سے جُدا کرتی تھیں مختلف پھاٹکوں میں سے گذر کر مختلف بارکوں اور کوٹھڑیوں کو راستے جاتے تھے اور ایک پھاٹک سے گزر کر آنے والی بیرک کے قیدی دوسرے پھاٹک کے اندر کی دوسری بیرک یا کوٹھڑی

کے قیدیوں سے نہیں مل سکتے تھے۔ جیل ایک ہی تھا مگر اس کے اندر سات اور جیل تعمیر کئے ہوئے تھے اور ان پر بھی سینکڑوں ایسی پابندیاں تھیں جو ایک جیل میں ہزار ہا جیل بنا رہی تھیں۔ میرے حصے میں آنے والی دوم تنہائی ان مجرموں کے لئے تھی جو جیل میں سب سے زیادہ خطرناک اور بدمعاش سمجھے جاتے تھے، جن کو جیل کے افسروں کی بے عزتی کرنے، مشقت کرنے سے انکار کرنے یا جیل کا ڈسپلن توڑنے کے جرم میں یہ سزا دی جاتی ہے کہ انہیں دن رات بند رکھا جاتا ہے، ان پر سخت پہرہ ہوتا ہے اور انہیں نہایت خطرناک بدمعاش تسلیم کر لیا جاتا ہے، تب کہیں جا کر وہ ان "تنہائیوں" میں پہنچتے ہیں۔ دوم تنہائی میں دورویہ کوٹھڑیاں تھیں جن میں بڑے بڑے ڈاکو اور مجرم بند پڑے تھے۔ ان کوٹھڑیوں کے بیچوں بیچ میں جمعداروں کے ساتھ گزرتا آ رہا تھا کہ ایک آواز میرے کان میں آئی:-

"اوئے اسلم! بابو نوں ویکھیں کوئی نواں نواں پھسیا اے"

دوسری آواز آئی "یار کپڑے تو اچھے پہنے ہوئے ہیں۔ کس کیس میں آیا ہے؟"

"چار سو بیس میں معلوم ہوتا ہے"

"نہیں دفتر میں غبن کیا ہوگا؟" ایک اور نے کہا۔

مگر میں پہلے آدمی کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا "نہیں یار یہ تو سیفٹی معلوم ہوتا ہے"

معلوم نہیں غور سے دیکھنے پر اس نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ میں سیفٹی ایکٹ کا

قیدی ہوں۔ بہرحال اس کی پہچان پر مجھے قدرے سکون ہوا تاہم میں ان کوٹھڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنے آپ سے یہ ضرور کہتا رہا کہ " بھائی بغیر محنت کے اس جگہ پہنچنے کی سعادت ملی ہے اس کو نباہنا پڑے گا" مگر اندر ہی اندر میں لرز رہا تھا۔

موت کے مسافر

ان دورویہ کوٹھڑیوں کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا میدان نظر آیا جس کے تین طرف چار چار کوٹھڑیوں کے تین بلاک تھے۔ یہ تینوں بلاک پھانسی کی سزا پانے والوں کے لئے مخصوص تھے۔ وہی نقشہ سامنے تھا جو میں لاہور جیل کی چودہ نمبر بیرک میں دیکھ چکا تھا۔ اسی طرح کے جنگلے اور تالے، اسی طرح سپاہیوں کے پہرے اور ان کوٹھڑیوں میں بالکل اسی طرح بیٹھے یا لیٹے ہوئے زرد زرد انسان۔ یہ موت کے مسافر چھ چھ فٹ لمبی چوڑی پختہ سیمنٹ کی بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں بھوتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس ساری فضا اور اس سارے نقشہ میں موت کا سناٹا اور نزع کا کرب تھا۔ جب میں ان کے سامنے پہنچا تو مجھے جولائی کی صبح کی ہوا اتنی تیز سنسناتی اور چلاتی ہوئی معلوم ہوئی کہ میں گھبرا اٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری فضا، ساری زمین اور سارا آسمان رو رہا ہو۔ گویا موت کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہو۔ اس علاقے میں شیشم اور پیپل کے درخت کافی تھے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے ان درختوں کے پتوں کے ٹکرانے سے عجیب گھناؤنی اور ہولناک آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔

پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے تین بلاکوں کے عین درمیان میں ایک چھوٹے سے احاطہ کی چار دیواری کے لکڑی کے دروازہ پر پہنچ کر جمعدار رُک گیا اور جیب سے چابی نکال کر مجھ سے کہنے لگا " یہ لیجئے آپ کے لئے ڈپٹی صاحب نے یہ جگہ مقرر کی ہے ——"

یہ فقرہ سُن کر اور یہ سارا منظر دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ بدترین مجرموں کی کوٹھڑیوں سے گزر کر، ان سے بھی آگے موت کے مسافروں کے عین درمیان میں اس احاطہ میں بالکل تنہا رہ کر میں کتنے دن زندہ رہ سکتا ہوں، یہ سوال پہلی بار میرے دل میں پیدا ہوا مگر دل ہی میں رہ گیا۔ اس لئے کہ جمعدار نے تالہ کھولا۔ میں دروازہ سے گزرتا ہوا احاطہ میں داخل ہوا۔ ایک مٹکا پانی، ایک مٹی کا لوٹا، ایک پیالہ اور کھجور کی ایک چٹائی میرے حوالے کر کے جمعدار نے دروازہ بند کر دیا اور باہر سے تالہ لگا دیا۔ احاطہ میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس کمرے میں سلاخوں والے جنگلہ کا دروازہ تھا۔ مگر احاطہ کا دروازہ لکڑی کے دو پٹ کا دروازہ تھا جس میں سے کچھ دکھائی بھی نہیں دے سکتا تھا ——

اس چار دیواری میں چٹائی بچھا کر مٹی کے لوٹے کو سامنے رکھ کر جب میں لیٹا تو پہلی بار اس تنہائی کے احساس نے مجھے ڈس لیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن انہیں پیتے ہوئے میں نے جیسے اپنے آپ سے مذاق کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا "حمید اختر! اگر کبھی یہ بھی ہو نہیں تو شاید تم پیغمبر ہو جاتے"

پہلا دن

ڈسٹرکٹ جیل ملتان کی دوم تنہائی کے اس احاطہ میں میں نے پہلا دن جس طرح گذارا ہے وہ عمر بھر یاد رہے گا۔ احاطہ میں جو کمرہ تھا وہ لاہور کے ستیا خانہ کی کوٹھڑیوں سے قدرے بہتر تو تھا کیونکہ اس کی لمبائی چوڑائی ذرا زیادہ تھی۔ کمرے میں ایک سلاخدار دروازہ اور دو کھڑکیوں کے علاوہ دو روشندان بھی تھے۔ پھر اس کا کچا فرش بھی احاطہ کے صحن کی سطح سے کوئی آدھ فٹ اونچا تھا، لیکن تنہائی نے مجھے جس طرح گھیرا ہوا تھا اس سے میری رُوح لرز رہی تھی۔ احاطہ کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس پر تالہ پڑا ہوا تھا۔ احاطہ کے اندر کمرے میں کھجور کی ایک چٹائی پر مٹی کا پیالہ، مٹکا اور لوٹا سامنے رکھے ہیں بالکل یکہ و تنہا پڑا تھا۔ یہ دوپہر اتنی سنگین، اتنی شدید اور گراں بار تھی کہ میں اس کے نیچے پسا جا رہا تھا۔ اس پر ہوا کے جھکڑ فراٹے بھرتے ہوئے چل رہے تھے۔ احاطہ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ باہر پیپل اور شیشم کے درخت تھے جن کے پتے بڑے زور سے ہلتے اور سرسراتے ہوئے نظر آتے۔ پھر ہوا ان میں سے گویا چیختی اور روتی ہوئی گزرتی تھی۔

اس پر اس فضا اور ماحول کے ساتھ ساتھ اس احاطہ کا محلِ وقوع جو قاتلوں اور پھانسی کے امیدواروں کے درمیان تھا وہ اور بھی پریشان کن تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تنہائی تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر تو انسان بڑے سے بڑے فرعون سے ٹکرا سکتا ہے۔ بڑی بڑی مصیبتیں اور صدمے سہہ سکتا ہے لیکن ان کے بغیر

اس کی حیثیت اور اس کی وقعت کچھ بھی نہیں رہتی ۔

اس چٹائی پر لیٹے لیٹے پوری دوپہر میرے سامنے اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں کے چہرے آتے رہے اور لاہور جیل کے سیاست خانہ کی وہ تنگ و تاریک کوٹھڑیاں مجھے فردوسِ گم گشتہ بن کر یاد آ رہی تھیں جن کی تپتی ہوئی اور آگ برساتی ہوئی گرمی میں میں نے دو مہینے سے زیادہ عرصہ دوستوں کی معیت میں گزارا۔ کبھی مجھے ندیم قاسمی کی پیاری بچوں کی سی معصوم صورت نظر آتی۔ ان کی ہمدردی، شفقت اور محبت یاد آتی۔ وہ لطیفے، چٹکلے اور تاش کی بازیاں یاد آ جاتیں جنہوں نے مجھے دو مہینے کے اس پورے جانکاہ عرصے میں ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے بسر کرنے کے قابل بنایا۔ کبھی غلام محمد چائے کی کیتلی اٹھائے دوستوں کی خدمت میں مصروف نظر آتا تھا۔ وہ محبت اور خدمت کا پتلا جو صرف کام کرنا جانتا ہے۔ جو باتیں نہیں کرتا، صرف کام کرتا ہے اور دوستوں پر قربان ہوتا آیا ہے۔ پھر فیروز الدین منصور کی بوڑھی کھانسی اور اس کا کھلا ہوا منہ اور بچوں کی سی حرکتیں یاد آتیں۔ کبھی ظہیر کاشمیری کی بقول شخصے لوہچون داڑھی اور اس کی کشمیری گیتوں کی تانیں یاد آ جاتیں۔ پھر افضل اور شوکت منٹو اور تمام دوست جو جیل میں ہمارے ساتھ رہے سب یاد آنے لگے ۔ اب جانے یہ سب کہاں ہیں۔ ظالموں نے دنیا اور اس کے حسن اور اسکی گہما گہمی سے الگ کیا۔ عزیزوں اور محبوبوں سے جدا کیا۔ اس پر بھی ہم خوش رہے تو پھر سب کو ایک ایک کر کے جانے کہاں ڈال دیا۔ حسن عابدی کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اسے ہم سے جدا کر کے لاہور کے شاہی قلعہ میں لے گئے تھے۔ مجھے

بار بار اس کا خیال آ رہا تھا۔ کیونکہ لاہور کے قلعہ سے جو داستانیں منسوب ہوتی آئی ہیں ان سے ہر محبِ وطن شہری واقف ہے اور اس دہشت اور جبر کو جانتا ہے جو وہاں پر ہوتا ہے۔ نہ معلوم اس پر کیا گزر رہی ہو۔ کیا معلوم کتنے لوگوں کو ہم سے علیحدہ کر کے قلعہ میں ڈالا گیا ہو اور ان کے ساتھ کیا کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہو۔ پھر جن کو ایک ایک کر کے مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے ان کی کیا حالت ہو گی؟ میں بہت دیر تک یہ سب باتیں سوچتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔ اس تنہائی میں میں بچوں کی طرح پنجاب کی ہر جیل کے بارے میں سوچتا رہا اور پنجاب کے پورے نقشے کو اپنے ذہن میں لا کر بچوں کی طرح یہ غور کرتا رہا کہ شاید فلاں آدمی فلاں جیل میں ہو۔ پھر اپنے آپ سے کہتا نہیں وہ اس جیل میں نہیں ہو گا بلکہ فلاں جیل میں ہو گا!

اسی طرح خیالات کے تانے بانے میں غرق میں وقت گزارنے کی کوشش میں لگا رہا۔ لیکن وقت کسی طرح گزرنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دوپہر پہاڑ کی طرح میرے سینے پر سوار تھی۔ ملتان کی دوپہر اور جولائی کا مہینہ! ایسا سناٹا اور ایسی دہشت تھی، اور میرے دل کی حالت اتنی نازک تھی کہ مجھے کئی بار اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ میرے پاس دو تین کتابیں تھیں لیکن ڈپٹی صاحب نے باوجود میرے اس یقین دلانے کے کہ یہ لاہور سی۔ آئی۔ ڈی کی طرف سے سنسر ہو چکی ہیں، یہ سب کتابیں اپنے طور پر ایک بار پھر سنسر کرنے کے لئے رکھ لی تھیں۔ صرف ہیر وارث شاہ کا ایک نسخہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی۔ سب طرف سے مایوس ہو کر میں نے

اپنے سوٹ کیس میں سے ہیر وارث شاہ نکالی اور اپنے گلے کے پورے زور سے تان لگائی ؂

ہیر آکھیا جو گیا جھوٹ آکھیں کون رُٹھڑے یار منا وندا ای
ایسا کوئی ناں ملیا میں ڈھونڈھ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیا وندا ای

جیل کے سناٹے میں یہ آواز گونجی اور پھر گم ہوگئی۔ پھر خاموشی اور سکوت طاری ہوگیا۔

ہیر پڑھنے میں بھی مجھے لطف نہیں آرہا تھا۔ صبح سے چائے بھی نہیں پی تھی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آئندہ کے لئے چائے کی طرف سے صاف جواب دے دیا تھا اس لئے طبیعت بہت پریشان تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموش لیٹے ہوئے میں اپنی اس منحوس زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اتنے میں کسی چیز نے زور سے میری کمر پہ کاٹا۔

میں گھبرا کر اُٹھا اور اُٹھ کر جو میں نے چٹائی پر بچھی ہوئی اپنی سفید چادر پہ نظر دوڑائی تو مجھے اپنے اس بستر پہ کروڑوں کی تعداد میں چیونٹیاں نظر آئیں۔ قطار اندر قطار وہ چاروں طرف سے چلی آرہی تھیں اور میرے بستر پر ہی نہیں پورے جسم پر حملہ کر چکی تھیں۔ چیونٹیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سفید چادر پر انہوں نے بھورے رنگ کی ایک اور چادر بچھا دی تھی۔ نہ جانے کب سے وہ بھوکی پیاسی اس سرزمین پر رہ رہی تھیں۔ آج ان کو اپنی غذا نظر آرہی تھی اور وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھ رہی تھیں۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک مصیبت کے ساتھ کتنی بہت سی مصیبتیں چلی آرہی تھیں۔ اب اس عذاب سے کیسے نجات حاصل کروں؟ چارپائی نہیں ہے، زمین پر لیٹو نگا تو ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ میں کہاں پر آگیا ہوں خدا تعالےٰ نے تو یہ فرمایا تھا کہ قبر میں چیونٹیاں عذاب الٰہی بن کر نازل ہوں گی مگر میں قبر میں نہیں ہوں۔ بہت سوچا کہ کہیں قبر میں تو نہیں آگیا ہوں۔ حالات ملتے جلتے تھے آثار قرائن سے بھی شبہ ہوتا تھا کہ قبر ہی میں ہوں لیکن بہرحال دماغ نے یقین دلایا کہ قبر میں نہیں ہوں۔ تو پھر یہ عذاب الٰہی کیوں نازل ہو رہا ہے۔ میں نے تنگ آکر ان کو مارنا شروع کیا مگر وہ کہاں ختم ہونے والی تھیں۔ ایک مارتا تو دس اور آجاتیں۔ سگریٹ سلگا کر بہت سی زندہ آگ میں جلا ڈالیں مگر ان کا جذبہ بہت زبردست تھا کسی طرح باز نہ آتی تھیں۔ آخر میں ہی تنگ آکر اور یہ سوچ کر چپ بیٹھ گیا کہ بہت دنوں سے خانہ خالی میں پریشان تھیں، اب دیو آگیا ہے تو یہ بھی جوش میں آرہی ہیں۔ آہستہ آہستہ کم ہو جائیں گی۔

یہ فیصلہ کر کے لیٹ تو گیا مگر اننی چیونٹیاں بھلا آرام کہاں لینے دیتی ہیں۔ وقت گزارنے کے لئے میں نے مجبور ہو کر پھر ہیر وارث شاہ اٹھائی اور ایک تان پھر گلے کے پورے زور سے لگائی ؎

اسیں فقر اللہ دے ہاں پورے کجھ منگ لے اساں تھیں گورئیے نی
سوال کسے دا مول ناں رد کرئیے، دن رات اللہ نوں سورئیے نی

موت کا سکوت ایک دفعہ پھر ٹوٹ گیا۔ خاموشی اور سکوت کا طلسم ختم ہو گیا اور گویا یہ ڈراؤنی آواز دوپہر کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

پھر خاموشی چھا گئی ——— اچانک احاطہ کا دروازہ کھلا اور ایک کالا کلوٹا سپاہی وردی پہنے احاطے میں داخل ہوا۔ دروازہ کو اندر کی طرف سے احتیاط سے بند کر کے وہ قدم قدم چلتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں تو یہی سمجھا کہ یہ بھی مجھ سے کہے گا، کہ ڈپٹی صاحب نے حکم دیا ہے سی کلاس کے قیدی ہیر وارث شاہ او نچے سُروں میں نہیں پڑھ سکتے کیونکہ رولز اس کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن وہ بڑی معصومیت سے میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

”تُسیں ہیر پڑھ رہے سو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔

”میں تو ڈرتے ڈرتے آیا ہوں۔ ہمیں حکم ہے کہ آپ کے پاس نہ بیٹھیں۔ آپ کی باتیں نہ سُنیں لیکن میں ہیر کا ٹپّہ سُن کر آ گیا ہوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑی دیر ہیر نہیں سُنائیں گے؟“

میں نے اس کو بہت اصرار سے اپنے پاس بٹھا کر بہت دیر تک یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں کسی کے سامنے ہیر گا کر نہیں پڑھ سکتا۔ صرف اپنی تنہائی کے خوف سے نجات پانے کے لئے میں تھوڑی دیر گانے لگا تھا۔

پہلے تو اسے یقین نہیں آیا مگر تھوڑی دیر کے بعد جب اس کی سمجھ میں میری بات

آگئے تو وہ میرے پاس بیٹھ کر ہیر کی کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

"تم پڑھ سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو چار جماعتیں پڑھا ہوا ہوں جناب!" اس نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

تھوڑی دیر تک اپنے آپ گنگناتے رہنے کے بعد اس نے اونچے سُروں میں ہیر پڑھنا شروع کر دی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ گھنٹہ بھر تک وہ ہیر گاتا رہا اور میں سُنتا رہا۔ اس طرح اہلِ پنجاب کے اس عشقیہ قصے کے زور نے میری مصیبت کے اس پہاڑ سے دن میں چند لمحوں کے لئے خوشیوں کے موتی بھر دئے۔

سپاہی نے بڑی حسرت سے مجھے بتلایا کہ اسے ہیر پڑھنے کا بے حد شوق ہے مگر آج تک وہ اپنی قلیل تنخواہ میں سے تین چار روپے نکال کر یہ کتاب نہیں خرید سکا۔ اس لئے اسے پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا تم میرے پاس آ کر روزانہ اس کا سبق لے لیا کرو اور مجھے تھوڑی دیر تک ہیر سُنا بھی دیا کرو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا "میں تو سارا دن آپ کے پاس بیٹھا رہوں مگر ڈر آتا ہے۔ پھر بھی چوری چھُپے میں آجایا کروں گا اور آپ سے پڑھ بھی لیا کرونگا اور آپ کو سُنایا بھی کروں گا۔ اچھا اب دیر ہو گئی ہے کوئی افسر نہ آجائے۔ میں چلتا ہوں!"

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک قیدیوں اور قیدیوں کے ان محافظوں کے بارے میں سوچتا رہا جو اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اپنے روایتی ورثہ کے عاشق

ہونے کے باوجود اسے خرید کر اپنے پاس رکھنے کی استطاعت سے محروم ہیں۔

اس کے جانے کے بعد احاطہ کے باہر پھر تالہ پڑ گیا۔ پھر وہی کنج قفس تھا اور پھر وہی تنہائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی آمد

شام کے سائے اب کچھ بڑھ گئے تھے۔ میں نے کمرہ میں سے باہر نکل کر احاطہ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ احاطہ کے باہر چہل پہل کے آثار نظر آنے لگے تھے کیونکہ قیدی اب مختلف بارکوں میں اپنی مشقتوں سے فارغ ہو کر آ چکے تھے، اور ادھر اُدھر بیٹھے گپ کر رہے تھے۔ کچھ ٹہل بھی رہے تھے۔ بعض قیدی دو دو چار چار کی منڈلیوں میں جمع ہو کر گانے کا شغل بھی کر رہے تھے۔ میں نے یہ تمام منظر احاطہ کے دروازہ کی درزوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ میرا دروازوں کے ساتھ لگ کر اس طرح جھانکنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے مسلمان پردہ نشین عورتیں اپنے گھروں میں سے باہر کی دنیا کو دروازوں کی درمیانی درزوں میں سے جھانک لیا کرتی ہیں۔

اپنے مقابلے میں مجھے یہ اخلاقی قیدی جو نہ معلوم کتنی چوریوں اور ڈاکوں کے مقدمات میں ماخوذ تھے، بہت ہی خوش قسمت نظر آتے تھے کیونکہ وہ میری طرح تنہا نہیں تھے۔ انہوں نے جیل خانے میں بھی اپنی چھوٹی سی دنیا آباد کر لی تھی

ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم تھے ۔ اپنی دوستیاں و دشمنیاں اور اپنے پروگرام تھے ۔ وہ اپنے ہم جنسوں میں تو تھے ۔ لیکن میرے ارد گرد تو تنہائی اور اُداسی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا ۔

دروازہ سے الگ ہو کر میں نے پھر احاطہ میں ٹہلنا شروع کیا ۔ احاطہ کی لمبائی میرے کوئی بتیس قدموں میں ختم ہو جاتی تھی ۔ وقت گزارنے کے لئے میں نے اپنے قدم گننا شروع کئے ۔ پھر چوڑائی دیکھی کوئی بیس قدم ہو گی لیکن احاطہ کی چار دیواری بہت ہی اونچی تھی ۔ مجھے اپنے گرد کی چاروں دیواریں بہیلوں اونچی نظر آ رہی تھیں اور سر پر آسمان کا ایک ٹکڑا جو ٹوپی کی شکل میں اس چار دیواری پر جُھکا ہوا تھا ۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا ۔

وقت گزارنے کے لئے میں نے اس پہلے روز جس قسم کی حرکتیں کی ہیں، انہیں یاد کر کے مجھے اب تو ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت میں بچوں کی طرح ان حرکتوں ہی سے دل خوش کر رہا تھا ۔ احاطہ میں چکر لگاتے ہوئے میں اپنے قدموں کو گنتا تھا ۔ پھر چلنے سے زمین پر جو نشان بنتے تھے انہیں گنتا تھا ۔ پھر ہوا کی سائیں سائیں میں درختوں کے جو پتے زمین پر گرتے تھے انہیں جمع کر کے انکو مختلف ڈھیریوں میں تقسیم کرتا تھا لیکن دن کسی طرح گزرنے ہی میں نہ آتا تھا ۔ یوں تو مجھے اس احاطہ میں آئے چار پانچ گھنٹے ہی گزرے تھے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں صدیوں سے اس جگہ مقید ہوں ۔ اس چار دیواری میں، اس

آسمانی ٹوپی کو سر پر رکھے میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ میں بیسویں صدی کا روبن کروسو تو نہیں ہوں جسے اہرمنی طاقتیں اس گمنام جزیرے میں پھینک گئی ہیں۔ لیکن ٹھوس مادی حقیقتیں میرے سامنے تھیں۔ ٹھوس بھوری دیواریں میری چھاتی پہ سوار تھیں اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کر پاتا تھا۔ کہ میں حمید اختر نظر بند سی کلاس ہوں جسے رولز آگ جلانے یا چائے پکانے کی اجازت نہیں دیتے۔ جسے سونے کے لئے چارپائی نہیں مل سکتی جسے زندگی ہی میں ایک لحد میں اتار کر چیونٹیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے اور جسے گرفتار کر کے گورنر پنجاب بالکل مطمئن ہیں کہ اس شخص کو احتیاطی طور پر نظر بند رکھنا ضروری تھا ورنہ بصورت دیگر امن عامہ میں خلل پیدا ہونے کا امکان تھا۔

شام کے کوئی چار بجے احاطہ کا دروازہ کھلا اور جیل کے ڈاکٹر صاحب نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے ماتھے پر مجھ سے بات کرنے سے پہلے ہی تیوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہسپتال کے دو مشقتی دوا کی شیشیاں ایک بکس میں رکھے ہوئے ان کے آگے چل رہے تھے۔ دوا کی ان آٹھ بوتلوں میں جو ان کے ہمراہ تھیں، آٹھ، پندرہ، بیس، پچیس، تیس قسم کے نمبر لگے ہوئے تھے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ "لاہور میں مجھے چائے پکانے اور پینے کی اجازت تھی لیکن یہاں پر میرا چائے کا سامان روک لیا گیا ہے۔ میرا معدہ ہمیشہ خراب رہتا ہے اور چائے کے بغیر میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا"

"کوئی بات نہیں" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

میں نے پھر کہا "میری چھاتی میں درد رہتا ہے اور سانس لینے میں کافی تکلیف ہوتی ہے"

"پریشانیوں میں ایسا ہی ہو جاتا ہے" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب قبلہ!" میں نے پھر عرض کی "میرا معدہ اور ہاضمہ بے حد خراب ہے۔ ازراہِ کرم کوئی دوائی دیتے جائیے ورنہ میرے لئے بہت مشکل ہو جائے گی"

ڈاکٹر صاحب نے مشقتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو اٹھارہ نمبر دے دو"

مشقتی نے اٹھارہ نمبر کی بوتل اٹھائی۔ اس میں سے ایک خوراک انڈیلی اور میرے حوالے کر کے پھر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے دوائی کسی شیشی میں ڈال کر دی جائیں یا کوئی پڑیا ہی دے جائیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ قیدیوں کو شیشی رکھنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ شیشی توڑ کر اور اس کا شیشہ کھا کر قیدی خودکشی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب، ان کے مشقتی اور ان کی اٹھارہ، پندرہ اور بیس پچیس نمبر کی بوتلیں چلی گئیں۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ باہر پھر تالہ پڑ گیا۔ پھر وہی تنہائی اور ویرانی میرے

چاروں طرف پھیل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ روٹی آگئی ہے۔ لانگری ایک بڑی سی جالی کندھوں پر اٹھائے چلے آرہے تھے۔ جالی میں تنور کی بڑی بڑی روٹیاں تھیں اور لوہے کی بڑی بڑی بالٹیوں میں سبزی اور دال پکی ہوئی رکھی تھیں۔ دوم تنہائی کے تمام قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سے اپنی لوہے کی باٹیاں اٹھا لائے اور ایک قطار میں بیٹھ گئے۔ لانگری ہر قیدی کی باٹی میں دال اور سبزی ڈالتا اور ہر ایک کے ہاتھ پر تنور میں لگی ہوئی دو روٹیاں رکھ دیتا۔ تھوڑی دیر میں بھگتان ہو گیا اور قیدی روٹی کھانے میں مشغول نظر آئے۔

مجھے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ جب میں نے ایک لانگری کو پیتل کا تھال ہاتھ میں لئے اپنے دروازہ کی طرف بڑھتے دیکھا تو میں نے دروازہ سے ہٹ کر اندر سے چٹائی اٹھائی اور باہر احاطہ میں بیٹھ کر روٹی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں احاطہ کا دروازہ کھلا اور لانگری روٹیاں چٹائی پر رکھ کر اور دال اور سبزی میری پلیٹ میں ڈال کر چلتا بنا۔

میری دال اور پیٹھے کی سبزی میں تیل تو حسب وعدہ نہیں ڈالا گیا تھا مگر میرے سامنے سوال یہ تھا کہ اس میں گرم کئے بغیر گھی کیسے ڈالوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو چیونٹیاں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر آن پہنچی تھیں۔ دیکھتے

ہی دیکھتے یہ چیونٹیاں روٹیوں پر رینگتی نظر آئیں۔ میں نے ایک بار روٹیوں کو جھاڑ کر رکھا مگر یہ ظالم تو آنِ واحد میں روٹیوں کی اندرونی تہوں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان سے بچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

گھی گرم تو نہ کیا جا سکا مگر چونکہ گرمی کی وجہ سے پگھلا ہوا تھا اس لئے اسے اسی صورت میں دال اور سبزی میں ڈال کر میں نے کسی نہ کسی طرح چند لقمے زہر مار کئے۔ مٹی کے پیالہ میں پانی پی کر خدا کا شکر کیا اور چٹائی پر دراز ہو کر ہیر وارث شاہ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

شام ہو گئی تھی مگر یہ شام کتنی اُداس اور کس قدر گرانبار تھی۔ اس کا ایک ایک قدم مجھے کچلتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کی ویرانی اور اس کی خاموشی اور سکوت اور اس کا سناٹا چاروں طرف بکھرا پڑا تھا۔ میرے اپنے وجود اور میری روح میں اتنی کسک اور ایسا درد تھا جسے میں برداشت نہ کر پاتا تھا۔ تنہائی مجھے کاٹے کھا رہی تھی لیکن اسے برداشت کرنے اور اس ظلم کو سہنے کے سوا کچھ بھی تو نہ ہو سکتا تھا۔

راجہ صاحب

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور صبح والے فیکٹری انچارج بمعہ اپنے طرّے اور سنہری جوتے کے دروازے میں سے نمودار ہوئے۔ وہ اب بھی مسکرا رہے تھے اور اب بھی ان کے کرخت چہرے پر ان کی نرم و نازک عینک اور انکی ملائم مسکراہٹ

انسانیت کی جھلکی دکھا رہی تھی۔

پہلے تو میں انہیں دیکھ کر اور یہ سوچ کر بہت پریشان ہوا کہ افسوس ہے یہی حضرت میرے انچارج ہیں جنہیں صبح صبح دیکھ کر میں اس قدر ڈرا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر میں انکی عینک اور ان کی مسکراہٹ نے ڈھارس بندھائی تو میں نے ان کے سامنے بہت ہیچ و پکار کی۔

انہوں نے سب سے بڑا جواب تو یہی دیا کہ ڈپٹی صاحب بہت لائق فائق آدمی ہیں اور جیل کے قوانین کے ماہرین میں سے ہیں اس لئے انہوں نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ بہر حال انہوں نے چائے وغیرہ کے سلسلے میں مجھے یقین دلایا کہ وہ ڈپٹی صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے بات چیت کر کے اگر ممکن ہوا تو مجھے چائے پکانے اور پینے کی اجازت لے دیں گے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ "میں احاطہ ہی میں سوؤں گا؟"

انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا "بالکل آپ باہر احاطہ ہی میں سوئیں گے۔ ظاہر ہے کہ اتنی گرمی میں اندر سونا تو ممکن ہی نہیں ہے"

ان کے جانے کے بعد میں نے باہر احاطہ میں چٹائی پر اپنا بستر جمایا اور دل ہی دل میں راجہ صاحب کے متعلق غور کرنے لگا کہ صبح صبح میں ناحق ان کے بارے میں پریشان ہو رہا تھا۔ وہ تو اچھے آدمی نظر آتے ہیں۔

باہر گنتی بند ہو رہی تھی۔ تمام قیدیوں کو سپاہی ہانک ہانک کر اور ان کی کوٹھڑیوں

میں لیجا کر بند کر رہے تھے۔ تالوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایک عام افراتفری کا عالم تھا۔ میں اس شورِ محشر میں صرف یہ سوچ کر تھوڑی دیر کے لئے خوش ہوا کہ منجملہ اور مصیبتوں کے یہاں پر اس گرمی میں اندر سونے کا خوف تو دور ہوا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ احاطہ کا دروازہ کھلا اور راجہ صاحب پھر نمودار ہوئے۔ ان کے چہرے سے معذرت اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔ میرے پاس آ کر انہوں نے کہا "اوہ آپ تو لیٹ گئے جناب! مجھے افسوس ہے کہ میں نے لاعلمی کی وجہ سے آپ کو باہر سونے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اب ڈپٹی صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ رولز تو آپ کو باہر سونے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ آپ سی کلاس کے قیدی ہیں!"

میں نے بہت احتجاج کیا۔ ان سے لاکھ بار کہا کہ لاہور میں اگرچہ ایک مہینہ ہمیں اندر سونے ہی کے لئے مجبور کیا گیا تھا لیکن سوا مہینہ سے ہم لوگ باہر سو رہے تھے اور اس گرمی میں اندر سونا تو بالکل ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر میں نے یہ بھی کہا کہ جیل کے قوانین نے اگر لاہور میں ہمیں باہر سونے کی اجازت دے دی تھی تو ظاہر ہے کہ یہاں بھی وہی قوانین ہوں گے۔ لیکن راجہ صاحب یہی کہتے رہے کہ وہ مجبور ہیں۔ میں تو ان کا حکم ماننے کے لئے مجبور تھا ہی۔ چنانچہ میں نے اپنا بوریہ بستر سمیٹا اور کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

پہلی رات

اس کمرے کا دروازہ بند ہوا۔ پھر اس پر ایک موٹا تالہ پڑ گیا۔ پھر احاطہ کا دروازہ بند ہو گیا اور اس پر بھی ایک تالہ پڑ گیا۔ میرے کمرے کے سلاخدار دروازہ سے باہر ایک مدھم سی لالٹین رکھ دی گئی تھی۔ میں نے بستر اس طرح جمایا کہ لالٹین کی روشنی اتنی تو اندر پہنچ جائے جس میں میں کچھ پڑھ سکوں۔

میں لیٹ تو گیا مگر عجیب پُر اسرار اور ڈراؤنی رات تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی مگر یہ خاموشی جیسے زبان بن کر مجھے ڈس رہی تھی۔ ایسا ڈراؤنا سکوت اور اس قدر خوفناک ماحول تھا کہ میرا دل دہلنے لگا۔ کمرے میں جب کوئی چھپکلی سرسراتی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا سانپ یا بچھو ادھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ باہر گھری تاریکی تھی اور میں ایک ادیب، ایک حُسن کار اور ایک جذباتی انسان مُردہ لاش کی طرح اس کال کوٹھڑی میں لیٹا ہوا تھا۔

اس طرح لیٹے لیٹے ایک مدت گزر گئی۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ لالٹین جھلملا کر بجھ گئی اور جولائی کی اس تپتی اور آگ برساتی ہوئی رات میں میں بالکل تنہا بے یار و مددگار زمین پر لیٹا ہوا یہ سوچتا رہا کہ کیا واقعی نوعِ انسانی نے کوئی ترقی کی ہے۔ ایٹم اور سائنس کے اس زمانے میں اخلاقی قیدیوں ہی کے ساتھ نہیں بلکہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ انہیں زمین پر لٹایا جاتا ہے۔ بند کمروں اور اندھی

کال کوٹھریوں میں ملتان جیسے شہر میں بند کیا جاتا ہے۔ جیل کا گھنٹہ بجتا رہا۔ پہرہ والے نمبردار پہرہ بدلتے رہے اور چکّر کے برج کا نمبردار پکار پکار کر جیل کے سکوت کو توڑتا رہا مگر مجھے کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔

برج کا نمبردار جیل کے ایک ایک علاقہ کا نام لے کر پکارتا۔

"بارک چھ نمبر؛" اس کی آواز گونجتی۔

"سب اچھا!" چھ نمبر کا پہرہ دار نمبردار پورے زور سے جواب دیتا۔

"ہسپتال کا کمرہ؛"

"سب اچھا!"

"اول تنہائی؛"

"سب اچھا!"

"دوم تنہائی؛"

"سب اچھا!"

جب اس دوم تنہائی کے نمبردار نے چیخ کر سب اچھا کہا تو میرا دل چاہا کہ چیخ کر کہوں، ادھر سب اچھا نہیں ہے۔ ادھر تو بڑا کرب، اور بڑا درد ہے۔ ادھر ایک کال کوٹھری میں ایک ادیب پڑا تڑپ رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو سب اچھا۔ بھلا سب اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں تو موت ہی موت ہے، ظلم ہی ظلم ہے اور تم سب اچھا کہہ رہے ہو۔ اگر وہ نمبردار میرے پاس ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

میرے چاروں طرف پھانسی والے قیدی تھے۔ رات جوں جوں گذر رہی تھی، ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے، گا رہے تھے، چلّا رہے تھے، "اللہ رحم کرے گا" کی دعائیں مانگ رہے تھے مگر ان کی آوازوں میں موت کے خوف کی آمیزش صاف جھلک رہی تھی۔ آدھی رات تک وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک آدھ کے گانے کی آواز بھی آئی۔ ان کے درد بھرے فقرے بھی سنائی دیتے رہے۔ مگر ان سے جیل کا سکوت اور موت کی سی خاموشی ٹوٹتی نہیں تھی اور بڑھتی تھی کیونکہ ان کی آوازیں ایسا سوز اور اس قسم کا گداز تھا جو ہر موت کے دروازے پر پہنچنے والے کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ میں ان میں سے کسی سے واقف نہ تھا۔ ان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا لیکن لاہور میں پھانسی والوں کے پاس رہ کر میں اچھی طرح سے یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ آوازیں انہی لوگوں کی ہیں۔ آدھی رات کے وقت وہ بھی خاموش ہو گئے۔ صرف پہرہ والے نمبردار اور برج والا چیختا رہا۔

تالے

زمین پر لیٹے لیٹے میں نے یہ حساب لگانا شروع کیا کہ میں کتنے تالوں میں بند ہوں۔ ایک تالہ میرے کمرے پر تھا۔ دوسرا تالہ احاطہ کی چار دیواری کے دروازہ پر تھا۔ تیسرا تالہ دوحم تنہائی کے پھاٹک پر تھا۔ چوتھا تالہ اس راستے کے دروازہ پر تھا

جو دوم تنہائی کے پھاٹک سے جیل کی ڈیوڑھی کو جاتا تھا اور پانچواں اور چھٹا تالہ جیل کی ڈیوڑھی کے اندرونی اور بیرونی دروازوں پر تھا۔

یہ حساب لگاتے لگاتے مجھے ہنسی آگئی اور میں نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز میں کہا "حمید اختر! حضرت یوسف کو بی زلیخا نے سات تالوں میں بند کیا تھا اور تجھے حکومت پنجاب نے چھ تالوں میں بند کر دیا ہے۔ اگر حکومت تجھے بھی سات تالوں میں بند کرتی تو شاید تیرا نام بھی تاریخ کی کسی کتاب میں، کسی روایت میں زندہ رہ جاتا" لیکن حضرت یوسف تو خدا کے پیغمبر تھے اور میں ایک معمولی انسان تھا۔ نہ تو میں حضرت یوسف کا مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ ہی حکومت پنجاب بی زلیخا بن سکتی ہے۔

اس لئے میں اپنی اس بھونڈی مثال پر دیر تک ہنستا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ کتنے ہی تالے لگ جائیں، کتنی ہی پابندیاں عائد کر دی جائیں، انسانی روح تو قید نہیں کیجا سکتی۔ اسے کون مقید کر کے رکھ سکتا ہے۔ اس پر کون پابندی لگا سکتا ہے؟

یہ سوچتے سوچتے مجھے یہ ساری تکلیفیں اور پابندیاں اور تالوں اور دروازوں کا یہ سارا انتظام انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ میرے دل سے ایک دم سارا بوجھ اُتر گیا۔ مجھے واقعی اس ساری واردات، اس سارے عمل پر ہنسی آنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد میں بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

صبح سویرے آنکھ کھُلی تو میری دیگچی، چائے کی کیتلی اور چائے کی پتی کا ڈبہ میرے سرہانے رکھا تھا۔ غالباً جیل والوں نے مجھے زیادہ تنگ کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے

قوانین میں ترمیم کر کے اس کی اجازت دے دی تھی۔ صبح سویرے چائے کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ کمرہ کا دروازہ کھل چکا تھا چنانچہ میں چائے کا سامان اُٹھا کر احاطہ میں بنے ہوئے چولھے کی طرف بھاگا۔

چولھا نہ معلوم کب سے ویران پڑا تھا۔ اس کا منہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ چائے تو آ گئی لیکن چولھا گرم کرنے کی کیا صورت ہو گی کیونکہ میرے پاس ایندھن کا تو نام ونشان تک نہ تھا۔

تھوڑی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے جھاڑو اُٹھائی، اسے چولھے میں جھونکا۔ کچھ تنکے چٹائی میں سے نکالے، ایک پُرانی قمیص پھاڑی اور کسی نہ کسی طرح چائے بنا ڈالی۔

چٹائی پر بیٹھ کر میں دیر تک چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس وقت مجھے اس وقتی حظ کے سوا اور کچھ بھی یاد نہ رہا۔

چائے کا آخری گھونٹ ختم کرنے سے پہلے میں نے کئی دفعہ اپنی چائے کے ساتھ سگریٹ پینے کی عادت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے میں مدت سے چائے کے ساتھ سگریٹ پینے کی عادت میں مبتلا تھا۔ لاہور جیل میں ہر پندرہ روز کے بعد ملاقات کے وقت اتنے سگریٹ گھر سے آ جاتے تھے کہ یہ عادت کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی گئی۔ مگر لاہور سے دو سو میل دور ملتان جیل میں ایک تو یہ امید ہی نہ تھی کہ باقاعدگی سے گھر سے ملاقات کرنے کے لئے لوگ آتے رہیں گے اور ضرورت کا سامان

پہنچتا رہے گا۔ پھر ڈپٹی صاحب نے یہاں ایک اور قانون وضع کر لیا تھا جس کی رُو سے پچھلے روز مجھے صرف ایک پیکٹ سگریٹ ملا تھا۔ باقی کے تمام سگریٹ دوسرے سامان کے ساتھ انہوں نے جیل کی ڈیوڑھی ہی میں رکھ لیے تھے۔ اس نئی پابندی کی وجہ سے میں اور بھی پریشان تھا اور سگریٹ نوشی کی عادت میں حتی الامکان کمی کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے یہی فیصلہ کیا کہ چائے پینے کے دوران میں سگریٹ نہ پیئوں بلکہ وہی ایک سگریٹ چائے ختم کر کے پیئوں تاکہ پھر دو چار گھنٹے آرام سے نکل جائیں۔

چائے سے فارغ ہو کر میں نے پیکٹ کھولا تو اس میں کوئی سگریٹ موجود نہ تھا۔ رات اندھیرے میں پریشانی کے عالم میں میں نے اپنا سارا اسٹاک ختم کر ڈالا تھا۔ بڑی بوکھلاہٹ میں میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ احاطہ میں سے گزر کر احاطہ کے دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ درزوں میں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی آدمی نہ تھا دوم تنہائی کے تمام قیدی مختلف بارکوں میں مشقت کرنے چلے گئے تھے۔ جن کی مشقت مونج کوٹنے کی تھی وہ کسی ایک خاص بیرک میں پہنچا دیئے گئے تھے جہاں مونج کوٹنے کا کام ہوتا ہے۔ دوسرے کارخانے میں کاغذ گھوٹنے، دری بنانے یا اسی قسم کی مختلف مشقتوں کے سلسلے میں اپنے اپنے کام پر جا لگے تھے۔ دروازہ میں سے باہر مجھے ڈیوڑھی والا جمعدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھانسی کی کوٹھڑیوں پر مختلف پہریدار سپاہی موجود تھے۔ نگران کو اپنی ڈیوٹی کی جگہ سے ہلنے تک کی اجازت نہ تھی۔ نہ ہی میرا ان سے کوئی

واسطہ تھا بلکہ میرے دروازہ تک پہنچنا ان کے لئے نوکری سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ میں بڑی پریشانی کے عالم میں دروازہ کے ساتھ لگا بالکل اسی طرح دیر تک کھڑا رہا۔ جس طرح مسلمان پردہ نشین خواتین گھروں سے باہر جھانک کر دیکھا کرتی ہیں۔ چائے کے بعد اور پھر صبح کے وقت سگریٹ نہ ہونا بڑی قیامت کی بات تھی۔

میں نے کئی بار دروازہ تھپتھپایا مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا۔ مجھے اپنے آپ پر، جیل پر اور ڈپٹی صاحب پر اتنا سخت غصہ آرہا تھا کہ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چیخنے چلّانے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوا ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ ابھی اس قدر زور سے چلّاؤں کہ اچھا خاصہ ہنگامہ پیدا ہو جائے۔

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد جمعدار صاحب نمودار ہوئے۔ پھانسی کی کوٹھریوں کے پہریدار سپاہیوں نے غالباً اُن کو یہ بتا دیا تھا کہ میں چیخ رہا ہوں۔ وہ جمعدار نظر بند کو بڑی زبردست چیز سمجھتا تھا چنانچہ وہ تالہ کھول کر بڑا سہما اور ڈرا ہوا سا اندر داخل ہوا اور بولا "جناب! میں کیا کروں؟ اول تنہائی، دوم تنہائی اور ہسپتال کا علاقہ سب کے سب میرے چارج میں ہیں اور مجھے ہر طرف جا کر دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ میں یہاں رہوں اور اول تنہائی یا ہسپتال میں کوئی ہنگامہ ہو جائے تو میری شامت آجاتی ہے۔ جیل کا قانون تو اندھا ہے جی!"

میں نے کہا "حضرت! باتیں نہ بنائیے، بھاگ کر ڈیوڑھی سے سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آئیے"

جمعدار تھوڑی دیر میں خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ ڈپٹی صاحب ابھی آئے نہیں اور جس صندوق میں آپ کا سامان رکھا ہوا ہے اس کے قفل کی چابیاں انہی کے پاس ہیں اس لئے ان کے آنے پر ہی سگریٹ مل سکیں گے۔

دس بجے تک جمعدار نے ڈیوڑھی کے کوئی چار چکر لگائے۔ اور میرا برا حال تھا۔ سگریٹ میرے اپنے تھے۔ قانون عام اخلاقی قیدیوں تک کو سگریٹ اور بڑی اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیتا ہے مگر ڈپٹی صاحب نے مجھ پر محض اپنے بہاؤ ولی کا غلبہ ڈالنے کے لئے سگریٹ اپنے پاس رکھ لئے تھے اور میں چونکہ احاطہ کی قید تنہائی میں بند تھا اس لئے ان تک پہنچ کر ان سے لڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

دیر تک میں نئی مصیبتوں اور پابندیوں پر غور کرتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ دس پندرہ روز تک ڈپٹی صاحب نے مجھے سخت پریشان رکھا۔ سگریٹ ختم ہو جاتے، جمعدار ان کے پیچھے دوڑتے رہتے اور کافی تنگ کرنے کے بعد وہ اس دن کا پیکٹ مجھے دے کر میرے حال پر رحم کرتے، بہر حال دس پندرہ دن کے بعد میرے سگریٹ ڈیوڑھی کی بجائے میرے پاس ہی رہنے لگے تھے۔

ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں یہ دوسرا دن میرے لئے بڑی ہی مصیبت کا دن تھا ملتان کی گرمی بڑی خوفناک تھی۔ پھر تیز ہوا چلتی اور اتنی گرد اڑتی کہ میرا منہ، ناک، آنکھ اور تمام سامان اس میں لت پت ہو جاتا۔

پوچا

جیل کی زندگی میں پوچے کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ہر جیل میں قیدی اور حوالاتی صبح سویرے تمام احاطوں اور بیرکوں میں باقاعدگی سے پوچا کرتے ہیں اس کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کی بالٹیاں بھر کر وہ زمین پر گرا دیتے ہیں پھر اس پر رسّی سے بندھے ہوئے دری یا ٹاٹ کے ایک ٹکڑے کو اس طرح پھیر دیتے ہیں کہ زمین کی سطح پانی کو جذب کر کے اس کو ہموار کر دیتی ہے اور گرد دب جاتی ہے۔

دس بجے کے بعد میرے احاطہ میں بھی حوالاتیوں کا ایک قافلہ داخل ہوا۔ لیکن جمعدار ساتھ تھا۔ اس لئے کہ حوالاتی مجھ سے بات چیت نہ کر سکیں اور ان کے خیال کے مطابق میں ان میں اپنے جراثیم ڈالنے میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔

اس کام کے دوران میں البتہ یہ ضرور ہوا کہ احاطہ کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنی اس چھوٹی سی جیل کے باہر ذرا بڑی جیل دیکھنے کا موقعہ ملا۔ باہر بھی جیل ہی تھی اس سے آگے بھی جیل ہی تھی مگر مجھے اپنے احاطہ کی چار دیواری کے باہر کی جیل بڑی آزاد اور دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں اگر عام قیدیوں کی طرح کسی چوری، ڈاکے یا اغوا کے مقدمے میں آتا اور ان کے ساتھ رہتا۔ پوچا کرتا، مشقت کرتا تو یہ میرے سیاسی قیدی ہونے سے بہتر رہتا

کیونکہ باہر تمام قیدی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان میں آپس میں دوستیاں دشمنیاں، پسندیدگی ناپسندیدگی اور محبت اور نفرت کے انسانی جذبے موجود رہتے ہیں مگر میں تو سیاسی قیدی ہونے کے جرم میں ایسے کنوئیں میں ڈال دیا گیا تھا، جس میں سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ جس میں رہ کر میں تمام بنیادی انسانی جذبوں سے محروم ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمعدار کو کسی کام کے لئے حوالاتیوں کو چھوڑ کر احاطہ سے باہر جانا پڑا۔ اس کے جانے کے بعد میں احاطہ کے دروازہ کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ اس دروازہ کے چاروں طرف پھانسی والے قیدی تھے۔ ان کی شکلیں عجیب ڈراؤنی اور خوفناک تھیں۔ ایک تو ان کے ساتھ یہی تصور وابستہ ہوتا کہ وہ قتل کر کے آئے ہیں کچھ کم خوفناک نہیں ہوتا۔ دوسرے ان کی زرد شکلیں اور ان کو رکھے جانے کا طریقہ اس قدر ظالمانہ ہے کہ انہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد ہر آدمی پر دہشت اور ڈر غالب آجاتا ہے۔ مجھ میں ان کی طرف دیکھنے اور ان سے آنکھ تک ملانے کی جرأت نہ تھی۔

عملی صاحب

اتنے میں ایک پہرے دار سپاہی کی آواز آئی "او ئے عملیا کدھر چلیا ایں؟ پتہ نئیں اوہ سیفٹی قیدی ہے"

عملی نے جو میری طرف بڑھا آ رہا تھا اس آواز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، بس وہ ذرا سا مسکرا کر بولا "اچھا جی پتہ ہے پھر کیا ہوا میں تو یونہی ....." اور وہ پھر مسکراتا ہوا میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

عملی نے صرف ایک چھوٹا سا صافہ کمر پہ باندھ رکھا تھا۔ اس کا جسم خوفناک حد تک سیاہ تھا۔ اس کی مونچھیں کافی بڑی بڑی تھیں۔ میرے پاس آ کر اس نے کہا "بادشاہو افیم تو مل جاتی ہے مگر چائے کے بغیر زندگی کا مزا جاتا رہا۔ تھوڑی سی چائے کی پتی تو دے دیجئے"

میں نے لپٹن کے پیکٹ میں سے چائے کی پتی کافی مقدار میں اس کے حوالے کر دی۔ اس پتی کو حاصل کر کے عملی جس قدر خوش ہوا، اس کے سیاہ چہرے پر مسرت کی جو کرنیں نمودار ہوئیں وہ میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس نے جلدی سے پتی کو صافے میں اڑس لیا اور مجھ سے بولا "کوئی کام وام ہو تو بتائیے"

میں نے جواب دیا "بس تمہاری مہربانی"

اس کے بعد عملی چلا گیا مگر مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ وہ پرانا اور گھاگ مجرم ہونے کی وجہ سے جمعداروں، سپاہیوں اور جیل کے تمام افسروں کی نظریں بچا کر آگ بھی جلا لیتا ہے۔ اپنی لوہے کی باٹی میں پانی بھی گرم کر لیتا ہے۔ اور چائے پکا کر بڑے مزے سے پی لیتا ہے اور اس کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ چند دنوں کے بعد میں نے اپنے دروازہ کی درزوں میں سے اس سے سوال کیا "عملی ــــ تم

چائے میں میٹھا تو ڈال لیتے ہو مگر دودھ کے بغیر گڑ کی چائے کا قہوہ کیسے پی لیتے ہو؟"

"جناب بچیاں والیو!" اس نے کہا "دودھ کی چائے پیتا ہوں"

"دودھ کہاں سے لیتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہسپتال سے مریضوں کے لئے جو دودھ آتا ہے"

"کیسے لیتے ہو؟"

"قیمت دے کر!" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آپ کو نہیں معلوم، آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا۔ ہسپتال میں ان لوگوں کو کام پر لگایا جاتا ہے جو یا تو ڈاکٹر صاحب کے سفارشی ہوں یا جن کے وارث ڈاکٹر صاحب کو رشوت دے جائیں ڈاکٹر صاحب ان کے کارڈ پر ہلکی مشقت لکھ کر انہیں مریضوں کی دیکھ بھال، دودھ کی تقسیم اور ہسپتال کی صفائی وغیرہ پر مقرر کر دیتے ہیں۔ وہ پھر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ دودھ بیچتے ہیں، گھی اور چینی بیچتے ہیں —— اور ڈاکٹر صاحب اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں"

یہ انکشافات میرے لئے دلچسپ تو بہت تھے مگر عملی کو دروازے کی درز وں میں سے مجھ سے مصروف گفتگو ایک جمعدار نے دیکھ لیا۔ چنانچہ اس کو اس روز اس بری طرح سے پیٹا گیا کہ میں احاطہ کے اندر بیٹھا اس کی چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر ڈرتا رہا، مگر عملی صاحب آدھ گھنٹہ کے بعد اسی طرح خوش و خرم پھرتے ہوئے

نظر آئے۔

اس وقت کے بعد مجھ پہ پابندی اور بھی سخت کر دی گئی۔

شام کو ڈپٹی صاحب اپنے راؤنڈ پہ آئے۔ اس وقت تک میں کمرے میں بند کیا جا چکا تھا۔ گرمیوں کی شام کے یہی کوئی ساڑھے پانچ بجے ہوں گے کہ مجھے اندر ڈال کر باہر تالہ لگا دیا گیا۔ میں نے قمیص اتار دی اور صرف پائجامہ پہن کر اپنے بستر پہ بیٹھا ہوا سول اخبار پڑھ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب سلاخوں سے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔

اس وقت ان کے چہرے پر وہ جاہ و جلال نہیں تھا جو پہلے روز ڈیوڑھی میں نظر آیا تھا، بلکہ اس وقت وہ عام انسانوں کی طرح کے ایک آدمی نظر آ رہے تھے۔

"گرمی بہت ہے" انہوں نے خود ہی کہا۔

"جی ہاں گرمی تو بہت ہے" میں نے بھی جواب دیا "مجھے باہر سونے کی اجازت مل جائے تو اچھا ہے ورنہ میں مر جاؤں گا"

"نہیں بھئی" ڈپٹی صاحب نے کہنا شروع کیا "ہم کیا کریں، ہم تو خود مجبور ہیں۔ قانون اس کی اجازت ہی نہیں دیتا ورنہ ہمیں تم کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت؟"

"لیکن لاہور میں تو......"

"لاہور کی بات چھوڑو، تاہم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لاہور جیل میں تمہیں

کیسے باہر سونے کی اجازت مل گئی۔ سی کلاس میں اس کی اجازت ملنا مشکل ہی ہوتا ہے"

میں نے تھوڑی دیر رُک کر ذرا ہنستے ہوئے کہا "قبلہ! احاطہ کی دیواریں کم از کم چودہ فٹ اونچی ہیں۔ احاطہ کا دروازہ مقفل رہتا ہے۔ پھر میں نے کبھی قفل توڑنے یا نقب لگانے کا کام بھی نہیں کیا۔ ایسی صورت میں میں اگر رات کو احاطہ میں بھی سو جاؤں تو میرے بھاگ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں احاطہ میں سے کیسے بھاگ سکتا ہوں۔ پھر احاطہ سے باہر دوم تنہائی کا بڑا احاطہ اور پھاٹک ہے۔ اس سے آگے ڈیوڑھی تک جانے کے راستے کا مقفل پھاٹک ہے اور پھر ڈیوڑھی کے جہازی پھاٹک۔ اور بڑے بڑے تالے۔ ظاہر ہے ان سب کو توڑ کر جانے والا میں نہیں ہوں — پھر یہ کمرے میں بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ڈپٹی صاحب نے کہا "بات تو ٹھیک ہے مگر قانون یہی ہے کہ سی کلاس کے قیدی اندر سوئیں، ہم تو قانون کے غلام ہیں"

تھوڑی دیر رُکنے کے بعد انہوں نے پانی کے مٹکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مٹکا تو بھرا ہوا ہے نا؟"

میں نے عرض کیا "جی پانی ہی یہاں ایسی چیز ہے جس کی ابھی تک کمی نظر نہیں آئی"

"تم یوں کیا کرو" انہوں نے کہا "کہ جب تمہیں گرمی زیادہ لگے، تو ایک طرف ہو کر مٹکے کے پانی کو جسم پر انڈیل لیا کرو، جسم ٹھنڈا ہو جایا کرے گا اور تھوڑی دیر آرام رہے گا"

ڈپٹی صاحب تو یہ قیمتی نسخہ بتانے کے بعد چلے گئے مگر میں اسی طرح جولائی کی تپتی ہوئی گرمی میں اندر پڑا سڑتا رہا۔ قیامت کی گرمی تھی قمیص اتاری تو مچھروں نے پورے جسم کو نشانہ بنا کر حملہ پر حملہ شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں سارا بدن سُوج گیا۔ میں نے تنگ آ کر پھر قمیص پہن لی اور بستر پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

شام کا یہ وقت بڑی مشکل سے کٹ رہا تھا۔ اس شام میں نے گزرتے ہوئے وقت کے ایک لمحہ کے ہزارویں حصے تک کو محسوس کیا۔ وقت کے قدم اتنی سست رفتاری سے بڑھ رہے تھے اور یہ شام اتنی ڈراؤنی اور اس قدر تکلیف دہ تھی کہ مجھے اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی۔ انسان کی شکل تک سامنے نہیں تھی، بات کرنا، ہنسنا بولنا یا مذاق کرنا تو دور کی بات ہے، میں تو انسانوں کو دیکھنے تک کے لئے ترس گیا تھا۔

رات کو میرے جنگلے سے باہر لالٹین کی مدھم روشنی لرزتی رہی۔ پھر آخر وہ بھی ٹمٹما کر بجھ گئی۔ ایک چھٹانک تیل ایک لالٹین میں ڈال کر رکھنے کا حکم ہے مگر جمعدار، سپاہی، افسر سب اس تیل میں سے بھی اپنا اپنا حصہ لیتے تھے اس لئے تیل بہت تھوڑا ڈالا جاتا اور لالٹین دس بجتے تک بجھ جاتی۔ اس کے بجھنے کے بعد

میں خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹا زندگی، ماضی، حال اور مستقبل پر غور کرتا رہا۔
پھر ذہن خالی ہو گیا۔ کوئی آواز کوئی خیال، کچھ بھی باقی نہ رہا۔ محض سناٹا رہ گیا۔
یکایک سناٹا ٹوٹا اور ایک بھاری گرجدار آواز میرے احاطہ کے باہر کی پہلی پھانسی والی کوٹھڑی سے بلند ہوئی۔

"اوئے غلام علیا اوئے!"

"اوئے جی اوئے!"

"السلام علیکم، اوئے کیا حال ہے؟"

"وعلیکم السلام، اللہ اپنا رحم کرے گا مرید خاں ——! اللہ معافیاں دے گا مرید خاں ——!"

پہلی آواز کے مقابلہ میں دوسری آواز کسی نوجوان کی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں اس مختصر گفتگو کے بعد خاموش ہو گئے۔

کبھی کبھی کوئی پھانسی والا ماہیے کی کوئی کلی گا کر جیل کی فضا کو اپنے درد بھرے سوز اور میٹھی لے سے معمور کر دیتا۔ موت کی وادیوں اور گہرائیوں میں سے آتی ہوئی ماہیے کی یہ نرم کلیاں جیل کے سارے خالی پن، فضا کی ساری اُداسی اور دہشت کے ساتھ اس طرح مل جاتی گویا اس کرۂ ارض پہ درد بھری اذیتوں کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہیں رہا — انسان، عظیم انسان پابجولاں پختہ فرش پر لیٹا ہوا موت کے انتظار میں کس قدر بے بس اور کتنا معصوم ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ وہیں ہو سکتا ہے۔

آدھی رات کے بعد کہیں میری آنکھ لگ گئی، کیونکہ رات ڈھلنے کے بعد ہوا چلنے لگی تھی اور میری اس کوٹھڑی میں بھی اس کا کوئی ہلکا سا جھونکا پہنچ کر مجھے تھپتھپا جاتا تھا۔

وقت گزرنے لگا

آہستہ آہستہ میں اس قیدِ تنہائی کا بھی عادی ہو گیا۔ وقت گزرنے لگا۔ وقت گزرتا رہا۔ وقت تو ہمیشہ ہر جگہ گزرتا ہے، کسی کو اپنی چکّی میں پیس کر برابر کرتے ہوئے اور کسی پر اپنے رحم اور اپنے اکرام کی بارش کرتے ہوئے۔ مجھے وقت اپنے بے رحم ہاتھوں میں پیس کر ہی گزر رہا تھا۔

دن اتنے پہاڑ سے لمبے تھے اور راتیں اتنی کرب ناک اور تپتی ہوئی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ دن بھر میں اپنے احاطے میں ٹہلتا رہتا۔ احاطہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، میرے اپنے ہی قدموں کے نشان بن جاتے صبح کو جیالاتی پوچا کرنے کے لئے آتے تو یہ نشان مٹ جاتے۔ دروازہ پوچے کے لئے دس منٹ کھلتا اور پھر مقفّل ہو جاتا۔ پھر بھنگی آتا۔ دروازہ کھلتا اور پھر مقفّل ہو جاتا۔ پھر روٹی دینے کے لئے لانگری آتا۔ دروازہ ایک منٹ کے لئے کھلتا اور پھر مقفّل ہو جاتا۔ شام کو راجہ صاحب آتے۔ اب، ان کے چہرے کی خشونت نرمی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان کا وہ چہرہ جو پہلے دن مجھے اس قدر خوفناک دکھائی دیا تھا، اب

دب گیا تھا۔ اب ان کی ہنسی اور ان کی نرم و نازک عینک اس پر غالب آگئی تھی۔ وہ روزانہ شام کو ایک چکر لگاتے، مسکراتے ہوئے اور ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھتے "کوئی تکلیف؟"

میں جواب دیتا "کوئی ایک تکلیف ہو تو عرض کروں، یہاں تو اول و آخر تکلیف ہی تکلیف ہے اس لئے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کبھی کبھی میں کوئی چھوٹی موٹی تکلیف رفع کرنے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ بہت مسکرا کر بڑے اعتماد سے یہ کہہ کر چلے جاتے "جی بس بالکل ابھی ٹھیک ہو جائیگا" اور پھر کئی دن نظر نہ آتے۔ ان کی شکل و صورت کے برعکس وہ نوجوان اور نوآموز ہونے کی وجہ سے ابھی لوگوں کو صاف جواب دینے کے عادی نہیں ہوئے تھے اس کے علاوہ ان میں کچھ سماجی اور مجلسی شعور بھی موجود تھا جس کی وجہ سے وہ چند ہی روز بعد مجھ سے ہر مطالبہ پر ہاں کہہ دیتے لیکن اسے پورا نہ کر سکتے تو میرے پاس ہفتہ ہفتہ بھر نہ آتے۔

دن اتنے ویران تھے اور راتیں ایسی کڑی تھیں کہ میں کبھی کبھی بلبلا اُٹھتا چاروں طرف میلی بھوری اور بے مہر دیواریں تھیں اور سر پہ آسمان کی ٹوپی، مگر یہ ایسی سلیمانی ٹوپی تھی جسے پہن کر میں خود کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ ان دنوں میں بڑی سنجیدگی سے غور کرتا رہا کہ زمین اور آسمان کے درمیان میرے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے قدموں کے نیچے زمین ہے اور سر پہ آسمان اور بس اس کے

علاوہ کچھ نہیں ۔ یہی دو اٹل حقیقتیں ہیں ۔ یہی سب سے بڑی صداقت ہے اور اسی کو انسان فراموش کر کے ان کے درمیان کی چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے ۔ ان میں دلچسپی لیتا ہے ۔ خود میں نے بھی یہی کیا کہ زمین اور آسمان کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی ۔ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر جو کچھ ہے اسے ہی دیکھتا رہا ۔ پھولوں سے، بچوں سے، عورتوں سے، باغوں اور ندیوں اور چشموں سے پیار کرتا رہا ۔ مگر اب آ کر یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی سچا رفیق نہیں ہے ۔ کوئی پھول نظر کے سامنے نہیں کھلتا ۔ کوئی زلف نہیں لہراتی، کسی چشمہ کا شفاف پانی نظر نہیں آتا ۔ صرف دو حقیقتیں ہیں اٹل اور انسان کی ازلی رفیق زمین جو نیچے تھی اور آسمان جو سر پر ہے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے ۔

ریاکاری

پہلے دس پندرہ روز کے تجربے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ریاکاری جیل کے افسروں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ وہ کبھی سچی بات نہیں کہتے ۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں ۔ ڈپٹی صاحب اب میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے اور میرے سامنے آ کر نوکری والے جمعداروں اور سپاہیوں سے کہتے "بھئی کبھی کبھی اس کے پاس آ بیٹھا کرو تا کہ اس کی تنہائی میں کچھ کمی ہو جائے" مگر باہر نکل کر انہی سے کہتے "خبردار! اس کے پاس ہرگز نہ جانا اور کسی قیدی، کسی

حوالاتی کو ادھر جھانکنے بھی مت دینا"۔

بیچارے جمعدار اور سپاہی عجیب مصیبت میں تھے۔ آخر تنگ آ کر وہ مجھ سے سچ سچ کہہ دیتے۔

ایک روز تو میں تنہائی سے تنگ آ کر بوکھلا گیا۔ شام کو ڈپٹی صاحب آئے تو میں نے ان سے کہا "جنابِ عالی! میں اس تنہائی سے پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ میرے وارنٹ پر قیدِ تنہائی کی سزا نہیں لکھی۔ مجھے سیفٹی ایکٹ میں نظر بند کرنے کا وارنٹ ہے، قیدِ تنہائی میں مار ڈالنے کے لئے نہیں لکھا ہوا ہے۔ اگر مجھے مارنا ہی ہے تو ایک ہی دن مار کر قصہ ختم کر دیجئے"

ڈپٹی صاحب نے بہت سوچ بچار کر کے بظاہر ہمدردانہ لہجہ میں کہا "تمہارے وارنٹ پر تنہائی کی قید نہیں لکھی ہوئی مگر تمہاری تنہائی automatic قسم کی ہے۔ کیونکہ نظر بندوں کے قانون میں یہ لکھا ہوا ہے کہ انہیں دوسرے قیدیوں سے نہ ملنے دیا جائے اب کوئی اور سیاسی قیدی آ جائے تو اسے تمہارے ساتھ رکھ دیا جائے ــــ اس کے علاوہ تو اور کچھ نہیں ہو سکتا"

میں نے کہا "خدا کے لئے کسی اور کو گرفتار کرائیے۔ یہ اہالیانِ ملتان اسقدر مردہ دل کیوں ہو گئے ہیں۔ کوئی صاحبِ دل اس شہر میں ایسا نہیں ہے جو ایک تقریر کر کے گرفتار ہو جائے۔ مولوی مودودی کے کسی چیلے ہی کو پکڑ لائیے۔ کوئی انسان تو ہو جس سے میں بات کر سکوں"

مگر افسوس ہے کہ نہ تو ڈپٹی صاحب میری بات مانے اور نہ ملتان شہر ہی نے کوئی صاحب دل پیدا کیا۔

میں نے علامہ اقبال کے اس مصرع کا ورد کرنا شروع کر دیا کہ

ع یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

حسن عابدی

چند روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس جیل میں ایک اور سیاسی قیدی آیا ہے۔ بس اڑتی اڑتی یہ خبر مجھ تک پہنچ گئی۔ افسر لوگوں نے اس معاملہ میں بات تک نہ کی۔ ملازموں اور نمبرداروں کی زبانی معلوم تو ہو گیا کہ کوئی اور سیاسی قیدی آیا ہے مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے۔ افسروں سے میں اس وجہ سے نہ پوچھ سکا کہ ان سے پوچھا تو وہ کہیں گے تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ اور ممکن ہے وہ ڈیوٹی والے جمعدار ہی کو معطل کر دیں یا کوئی سزا دے دیں کہ یہ بات مجھ تک کیسے پہنچ گئی۔

مجھ پر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ ایک مہینہ کے بعد مجھے نئے سیاسی قیدی کی شکل و صورت اور حلیہ معلوم ہوا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا اس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ وہ حسن عابدی ہے۔ مگر اسے مجھ سے علیحدہ رکھ کر جیل والوں نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ میرے بارے میں یا تو قید تنہائی کے احکامات

حکومت کی طرف سے ہیں جو یہ لوگ مجھے بتا نہیں رہے ہیں، یا یہی لوگ میرا دماغ درست کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کوئی ڈیڑھ مہینہ کے بعد مجھے اس بارے میں راجہ صاحب سے بات چیت کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ سول ملٹری اور زمیندار اخبار جو مجھے پڑھنے کیلئے ملتے تھے پہلے میرے پاس کئی کئی دن پڑے رہتے تھے مگر جب سے حسن عابدی آیا تھا ڈیوڑھی سے بار بار آدمی چکر لگاتا اور اخبار کا مطالبہ کرتا۔ ایک شام میں نے راجہ صاحب سے کہہ دیا "آج کل اخبار میرے پاس پہنچتا ہے تو فوراً واپسی کا مطالبہ شروع ہو جاتا ہے۔ کیا جیل میں کوئی دوسرا سیاسی قیدی آگیا ہے؟"

راجہ صاحب نے پہلے تو انکار کیا مگر ابھی ان کی جیل کی سروس چند برس کی تھی اس لئے ان میں ریاکاری کم تھی۔ پھر وہ جھوٹ بولتے ہوئے فوراً پکڑے جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے جھوٹے انکار پر ان کو پکڑ لیا تو وہ مان گئے۔

میں نے فوراً انہیں ان کا دوسرے سیاسی قیدی کے آنے پر اسے میرے ساتھ رکھے جانے کا وعدہ یاد کرایا تو وہ بولے "وہ بی کلاس کا سیاسی قیدی ہے اس لئے اسے آپ کے ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔"

بات ختم ہو گئی، حسن عابدی کو ہمارے ساتھ لاہور جیل میں تو سی کلاس ہی میں رکھا گیا تھا مگر بعد میں شاید اسے کلاس مل گئی تھی۔ اس لئے ایک جیل میں

ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ الگ الگ رہنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ کوئی ایسا قانون تو مجھے نہیں معلوم تھا مگر مجھے بتایا یہی گیا کہ ہم کو ایک ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔

اس شام مجھے ایک بار پھر یہ سوچنا پڑا کہ مجھ پر سی۔ آئی۔ ڈی والوں کی خاص نظرِ عنایت ہے۔ ندیم صاحب کو کلاس مل گئی تھی، عابدی کو بھی مل گئی، میں نے بھی لاہور جیل میں ان کے ساتھ ہی بہتر کلاس حاصل کرنے کی عرضی دی تھی، مگر پولیس والوں نے مجھے سی کلاس میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو ضرور میں نے کوئی سنگین جرم کیا ہے۔

اس سنگین جرم کو ڈھونڈنے کی میں نے بہت دنوں کوشش کی، لاکھ مغز کھپائی کی مگر مجھے اپنا کوئی بھی سنگین جرم یاد نہ آیا۔ میں کہانیاں لکھتا تھا۔ اخباروں میں مضمون لکھتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی اخبار میں کام کرتا تھا۔ ان میں سے ہر حیثیت مجھے بی کلاس کے قابل بناتی تھی۔ ادیب کو بہتر کلاس ملتی ہے — اخبار نویس کو بہتر کلاس ملتی ہے، کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی اخبار میں کام کرنے والا بھی دنیا بھر میں بہتر کلاس کا مستحق ہوتا ہے مگر مجھے یار لوگوں نے چاروں شانے چت کر رکھا تھا۔

اسی ہفتے میں نے پریڈ کے موقعے پر سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کاغذ، قلم دوات اور کلاس کے عرضی لکھنے کی اجازت حاصل کر لی۔ چنانچہ اگلے روز میں نے دوبارہ ہوم سیکرٹری کو عرضی لکھی۔ اس میں بہتر کلاس کی درخواست کی اور پچھلیوں

اس حماقت میں مبتلا رہا کہ میری عرضی پر کوئی ایکشن لیا جائے گا اور مجھے بہتر کلاس مل جائے گی۔

نئے سپرنٹنڈنٹ آ گئے تھے۔ کیمبل پور کے پٹھان تھے اور مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ فارسی کے کافی سلجھے ہوئے شاعر بھی ہیں تو مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی کہ شاعر خواہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہی کیوں نہ ہو، شریف آدمی ہوگا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب واقعی شرافت کے پتلے تھے چنانچہ پریڈ پر انہوں نے مجھ سے جب پوچھا کہ تم کیا ہو تو میں نے جواب دیا کہ "افسانہ نگار اور اخبار نویس ہوں"

وہ یہ جواب سن کر کچھ سوچتے ہوئے جانے لگے تو میں نے کہا "حضور ایک گزارش ہے"

وہ رک گئے تو میں نے کہا "تنہائی کی قید میں رکھ کے آپ لوگ مجھ پہ سخت ظلم کر رہے ہیں۔ میرے وارنٹ پر بھی کہیں قیدِ تنہائی نہیں لکھا ہوا اور میں اس تنہائی میں پاگل ہو جاؤں گا"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "واہ! ادیب اور شاعر لوگوں کو تو تنہائی کی تلاش رہتی ہے۔ تنہائی میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ آپ اس سے اسقدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟"

میں نے کہا "جناب! یہ تنہائی تو میرے لئے بیماری ہو گئی ہے۔ ایسی تنہائی تو

کسی بھی ادیب اور شاعر نے کبھی نہیں مانگی ہو گی۔ پھر اگر آپ مجھے تنہائی میں رکھ کر سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع دینا چاہتے ہیں تو قلم دوات اور کاغذ رکھنے کی بھی اجازت دے دیجئے تاکہ میں کچھ لکھ ہی سکوں"

"حکومت کی طرف سے بڑی سخت پابندی ہے" انہوں نے کہا "کہ آپ لوگوں کے پاس کاغذ قلم دوات نہ رہنے پائے۔ قلم دوات تو نظر بند کو مل ہی نہیں سکتی۔ آپ پڑھتے اور سوچتے رہئے، باہر جا کر لکھئے"

جاتے جاتے انہوں نے کہا "آپ قرآن شریف پڑھا کیجئے آپ کے دل کو قرار آجائے گا" پھر ڈپٹی صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "ان کو ایک قرآن شریف بھجوا دیجئے" یہ کہہ کر وہ اپنے سٹاف کے قافلہ سمیت رخصت ہو گئے۔

میں نے دل میں سوچا کہ میرے دل کو تو آپ کی گفتگو سن کر ہی کافی قرار آگیا ہے۔ اب قرآن شریف پڑھ کر کیا کروں گا۔

اگست کا مہینہ بھی گزر گیا۔ ستمبر شروع ہو گیا۔ رت بدل رہی تھی، درختوں کے پتے دن بھر گرتے رہتے اور بدلتی ہوئی رت کی اداسی پورے ماحول، پوری فضا اور پوری دنیا پر چھا گئی تھی۔ میں تنہائی کے کنوئیں میں اسی طرح غرق رہا۔ گھر سے کوئی نہ آیا تھا۔ بہن کے خط آتے تو ان میں اس کی بیماری کا ذکر ہوتا جس سے پریشانی اور بڑھ جاتی۔ راتیں اسی طرح تڑپتے ہوئے گزرتیں۔ وقت گزارنے کیلئے

میں نے عجیب عجیب راستے نکالے تھے ۔ جو اخبار مجھے پڑھنے کے لئے ملتے تھے وہ اس قسم کے تھے کہ ان کو پڑھنے کے بعد میں اپنے آپ سے سوال کرتا کہ "کون کہتا ہے سیاسی قیدیوں سے مشقت نہیں لی جاتی ۔ یہ اخبار پڑھنے کے لئے دے کر جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی مشقت بھی کرائی جاتی ہے ۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ میں ان اخباروں کو الف سے یَ تک پڑھتا ۔ بلکہ بیادگار...... اور پرنٹر پبلشر تک کی لائنیں پڑھتا ۔ انگریزی اخبار کو پہلے صفحے کے پہلے کالم سے پڑھنا شروع کرتا ۔ عام طور پر پہلے صفحے کی خبریں اندر کے صفحوں یا آخری صفحوں پر جاتی ہیں ایسی صورت میں میں، پہلے صفحے پر آدھی خبر پڑھ کر چھوڑ دیتا اور اندر کے صفحوں یا آخر تک خبر پڑھ کر ختم نہ کرتا بلکہ ترتیب وار خبریں پڑھتا رہتا ۔ جو خبر پہلے صفحے پر ختم ہو جاتی اسے اس امید پر چھوڑ دیتا کہ اخبار ختم کر کے اسے مکمل کروں گا اس طرح سارا اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپی قائم رہتی اور ذہن میں یہ خیال لگا رہتا کہ پتہ نہیں اس خبر کے آخر میں کیا لکھا ہوگا ۔ اخبار ختم کر کے اسے پڑھوں گا ۔ پھر میں نے اس عادت کو اور بھی ترقی دی اور تمام خبریں آدھی پڑھنے کے بعد اخبار مکمل کر کے پھر ان کے آخری آدھے حصے پڑھتا ۔ تاکہ وقت کسی نہ کسی طرح کٹ جائے ۔

چیونٹیاں اسی طرح تنگ کر رہی تھیں ۔ ان سے بچنے کے تمام ذرائع میں نے آزما کر دیکھ لئے تھے مگر وہ میرے بستر، میری روٹی اور کھانے کی تمام چیزوں تک

فوراً پہنچ جاتیں۔ بستر زمین پر تھا۔ اس لئے ان کو اس تک پہنچنے میں بڑی آسانی تھی مگر میرے پاس ان کو روکنے کا کوئی بھی ذریعہ نہ تھا۔ تنگ آ کر میں نے ان کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا اور انہیں پوری آزادی دے دی کہ وہ قبر میں پہنچنے سے پہلے مجھ پر عذاب الٰہی بن کر نازل ہوں۔

لڑ جھگڑ کر میں نے لالٹین اندر اپنے سرہانے رکھنے کی اجازت لے لی، مگر لالٹین کے ساتھ ہی ہزاروں اور بلائیں بھی نازل ہو گئیں۔ اس کے روشن ہوتے ہی ہزاروں پتنگوں اور کیڑوں مکوڑوں کی درجنوں قسمیں میرے سرہانے آ کر جمع ہو جاتیں۔ شمع کے یہ پروانے کبھی شمع پر گرتے تو کبھی مجھ پر۔ ان کی یلغار سے تنگ آ کر لالٹین کو ذرا فاصلہ پر رکھتا تو کچھ نظر نہ آتا۔ پھر قریب کرتا تو پروانے زچ کرتے۔ میں یہی سوچتا رہا کہ پرانے شاعر کتنے بیہودہ تھے جو عمر بھر ان پتنگوں کے قصیدے گاتے رہے جن کی مکروہ شکلوں سے گھن آتی ہے اور جو جسم سے ٹکراتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن ایک چھپکلی کہیں سے آنکلی تھی، ننھی سی جان تھی مگر اس نے آتے ہی پروانوں کا صفایا شروع کر دیا۔ مجھے چھپکلی سے ہمیشہ نفرت رہی مگر اس روز میں نے اس سے عشق شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے تو ہمیشہ پروانوں کی آمد کے بعد میں اس کا منتظر رہتا اور اگر وہ کچھ دیر کے لئے نہ آتی تو میں اپنے فرش پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا رہتا اور تنہائی میں اسے پکارتا ”اے مری شمعِ شبستان وصال! جانِ جہاں، میری

نازنین گمنام حسینہ! تو کہاں ہے؟ جلدی آ کہ شمع کے یہ پروانے میری جان کھا رہے ہیں۔"

حشرات الارض

صاحب نظر لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ملتان کی سرزمین حشرات الارض کے لئے مشہور رہی ہے۔ تنہائی میں میں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کیونکہ میری کوٹھڑی اور میرے احاطے میں اتنی قسم کے کیڑے مکوڑے تھے کہ اس سے پہلے میں نے ان کو کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ چیونٹیاں ہی کوئی پانچ قسم کی تھیں۔ ایک تو بہت باریک اور بڑی نازک اندام قسم کی بھوری چیونٹیاں تھیں۔ پھر ان سے ذرا بڑی تھیں۔ پھر ایک اور قسم بھی تھی جو ان دونوں سے بڑی تھیں اور ان کا جسم سیاہی مائل تھا۔ اس سے بڑھ کر ایک اور قسم کی چیونٹی بھی تھی جو مکوڑے اور چیونٹی کے درمیان کی ارتقائی کڑی نظر آتی تھی۔ یہ سب سے شریف قسم کی چیونٹیاں نظر آتی تھیں کیونکہ یہ بستر پر میرے ساتھ لیٹی رہتی تھیں مگر کاٹنے کی تکلیف نہ کرتی تھیں۔

ان کے علاوہ ایک روز ایک کنکھجورا صاحب بھی برآمد ہوئے۔ مگر آپ کی موت آپ کو دن کے وقت باہر لے آئی تھی۔ چنانچہ میں نے ان کو مار کر وہیں دفن کر دیا۔ ایک رات میں سو یا ہوا تھا کہ ایک مینڈک صاحب ٹہلتے ہوئے آئے اور میری چھاتی پر سوار ہو گئے میرے جسم کو ٹھنڈک محسوس ہوئی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مینڈک کو اپنے اوپر سوار دیکھ کر میری

چیخ نکل گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے اپنے جسم سے الگ کر کے پھینکا مگر وہ پھر اطمینان سے میری طرف بڑھنے لگا۔ خوش قسمتی سے لالٹین ابھی جل رہی تھی۔ میں نے اسے دوسری بار جوتی سے پرے دھکیلا مگر وہ پھر پلٹا اور گھور کے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر اُبلے پڑ رہے تھے اور وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے پسینے آ گئے۔ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دروازہ کا جنگلہ مقفّل تھا۔ احاطہ کا دروازہ بھی بند تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور جھاڑو لے کر اور آنکھیں بند کر کے میں نے اسے بڑے زور سے جنگلے سے باہر احاطہ کے صحن میں پھینک دیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ٹہلتے ہوئے پھر تشریف لا رہے ہیں۔

اب تو میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا کہ یہ کوئی بد رُوح ہے اور یہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ گھبرا کر میں نے چلاّنا اور نمبردار کو بلانا شروع کیا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد پہرہ والا نمبردار برآمد ہوا۔ احاطہ کا دروازہ کھول کر وہ میرے جنگلہ کے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا "شاہ جی ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

وہ بیچارہ یہ سمجھا کہ شاید میں بیمار ہوں یا میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو مینڈک سے اپنے معرکے کی پوری داستان سُنائی اور ہکلاتے ہوئے کہا "یار اسے میں نے چار بار باہر پھینکا ہے مگر یہ پھر آ جاتا ہے"

نمبردار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ذرا اب کی بار اسے پھر باہر دھکیل دو"۔ نمبردار کی موجودگی کی وجہ سے میرا حوصلہ واپس آ رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے

مینڈک کو ایک بار پھر باہر دھکیلا۔ نمبردار نے جھٹ اسے پکڑ کر اپنے ہاتھ پر بٹھلایا اور بولا۔ "مینڈک کو کبھی باہر کی طرف نہیں دھکیلنا چاہئے۔ کیونکہ اسے جس طرف سے روکو یہ پھر اسی طرف آتا ہے"

نمبردار تو یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ مگر میں بڑی دیر تک مینڈک کے کردار کے اس پہلو پر غور کرتا رہا جو اب تک میری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ اس رات میں نے سوچا کہ انسان تو یہاں مجھ سے کوئی نہیں ملے گا۔ حشرات الارض میں رہتے ہو تو انہی سے دوستی کرو اور انہیں میں سے ایک بن جاؤ، تب گزارا ہو گا۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ باہر کا دروازہ اسی طرح مقفل تھا۔ میرے سر پر وہی آسمانی ٹوپی اور قدموں کے نیچے وہی بے رحم زمین تھی۔ میں نے چٹائی بچھا کر کئی بار باہر احاطے میں بیٹھنے کی کوشش کی مگر چیونٹیاں کسی طرح بیٹھنے ہی نہ دیتی تھیں۔ میرے چٹائی پر بیٹھتے ہی ان کی یلغار شروع ہو جاتی اور وہ اپنے زور سے کاٹتیں کہ مجھے مجبوراً اُٹھ کر ٹہلنا پڑتا۔

اتنے میں میرا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ میں نے دروازے کے قریب آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اٹھارہ نمبر، پندرہ نمبر اور پچیس نمبر وغیرہ کے ساتھ باہر موجود ہیں۔ جس جمعدار کے پاس میرے تالے کی چابیاں تھیں وہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔ ظاہر ہے اسے جیل میں اور بہت سے کام بھی تھے۔ چنانچہ وہ جیل کے یا کسی اپنے کام کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے

شفقتی سے کہا "دروازوں کے بیچ میں سے دوائی کی خوراک دے دو۔ دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

چنانچہ ہسپتال کے شفقتی نے دروازے کے دونوں پٹ ذرا سے کھینچ کر ٹین کی وہ ڈبیا میری طرف بڑھا دی جو قیدیوں کو دوائی پلانے کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں نے دوائی پی تو لی مگر اس روز یہ سوچ کر میرے دل میں ایک مبہم سا خوف ضرور پیدا ہوا کہ اب ڈاکٹر صاحب نے یہ راستہ دیکھ لیا ہے۔ شام کے وقت روزانہ دوائی پینے کے بہانے سے جو یہ دروازہ ذرا سی دیر کے لئے کھلتا تھا اور میں جو اپنے احاطے سے باہر کی دنیا پر ایک نظر ڈالتا تھا اب وہ بھی نصیب نہ ہوگی۔ چنانچہ آئندہ کے واقعات نے میرے اس اندیشے کو صحیح ثابت کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد میں ابھی پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا کہ احاطے کا دروازہ کھلا اور راجہ صاحب مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ڈیوڑھی کا ایک نمبردار بھی تھا جس نے مٹھائی، آم، بسکٹ کے ڈبے، چائے، چینی، گھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سگریٹ کے پیکٹ اٹھائے ہوئے تھے۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ حبیب پاسلوی، جسے یاد کر کے میں لاہور سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی ہی میں ہنسنے اور رونے لگا تھا۔ آخر کار میرا مقام پتہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور شاہ شمس تبریز کے اس شہر میں جہاں میں حشرات الارض کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہوں۔ وہی میرے لئے یہ سب کچھ بھیج رہا ہے۔

حبیب میرا بچپن کا دوست ہے اور لدھیانہ کے ایک سکول میں ہم دونوں قرآن شریف حفظ کیا کرتے تھے۔ میں نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور جیل میں تھا۔ اس نے قرآن حفظ نہیں کیا تھا اس لئے جیل سے باہر تھا۔ اس کے اخلاص اور محبت کے بارے میں بچپن کی زندگی سے لے کر آج تک مجھے کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا لیکن اس روز اس نے جو انواع و اقسام کے لذیذ میووں، بسکٹوں، سگریٹوں، اور ضروریات کی چیزوں کے انبار میرے لئے بھیجے تو مجھے جیل کی اس ساری زندگی میں پہلی بار ایک قسم کے تحفظ کا احساس ہوا۔ پہلے مجھے یہ خیال لگا رہتا تھا کہ ایک تو ملتان تک میرے گھر کے لوگوں اور بالخصوص میری بہن کا پہنچنا ہی ناممکن ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے ذرائع بھی اتنے نہیں ہیں کہ وہ میری ضروریات پوری کر سکیں۔ سی کلاس میں رکھ کر مہربان حکومت نے مجھے ہی نہیں بلکہ میرے گھر والوں کو بھی شکنجے میں کس لیا تھا۔ سی کلاس میں دو عدد روٹی اور تیل میں پکی ہوئی سبزی کے علاوہ اور کچھ نہ ملتا تھا۔ ویسے تو باہر سے ہم ضرورت کی چیزیں منگوا سکتے تھے مگر ضرورت کی چیزوں کے لئے ظاہر ہے پیسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری کم از کم ضروریات دو سیر گھی، دو سیر چینی، دودھ کے دو ڈبے، سگریٹ بیڑی وغیرہ اسی قسم کی تھیں کہ تیس چالیس روپے ماہوار خرچ کر کے یہ سامان مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ مگر یہ رقم کہاں سے آئے گی۔ یہ سوال مجھے بے حد پریشان کرتا۔ دنیا بھر کی آزاد حکومتیں سیاسی نظر بندوں کی ضروریات ہی پوری نہیں کرتیں بلکہ ان کے پیچھے رہ جانے والوں کو بھی الاؤنس وغیرہ دیتی ہیں،

کیونکہ جب حکومت ایک شخص کو بغیر مقدمہ چلائے، بغیر کسی جرم کے نظر بند رکھتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ حکومت نے اپنی مصلحت کے پیش نظر اس کو بند کیا ہے اور قانونی اور اخلاقی طور پر اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرے گی۔ ہماری حکومت نے قانون اور اخلاق ایک مدت سے چھوڑ رکھا تھا اس لئے اگرچہ ہمیں احتیاطاً نظر بند کیا گیا تھا مگر یہ نظر بندی اس قسم کی تھی کہ جس سے ہمارے ساتھ ہمارے گھر والے بھی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ پھر بھی میں مدت سے اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ میرا خرچ کہاں سے چلے گا۔ مگر اس روز جب جیب نے یہ سامان بھیجا تو میری باچھیں کھل گئیں۔ اور راجہ صاحب کے جانے کے فوراً بعد میں نے وہ سارا سامان اپنے سامنے رکھ کر اسے چکھنے کا فیصلہ کیا۔ کافی دنوں سے جیل کی دال سبزی کھاتے کھاتے کسی اچھی چیز کے لئے زبان ترس گئی تھی۔ جیل کی دال سبزی تو معلوم ہوتا تھا صابن میں گھول کر پکائی جاتی ہے اس لئے میں نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے فیصلے کو فوری طور پر عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔

سب سے پہلے میں نے آم کی ایک قاش کھائی۔ پھر بسکٹ کا ایک ڈبہ کھول کر اس میں سے ایک بسکٹ نکال کر کھایا۔ پھر دوسرا ڈبہ کھول کر اس میں سے دوسری قسم کا ایک بسکٹ کھایا۔ دودھ کا ایک ڈبہ کھولا اور اس میں سے ایک چمچ دودھ بھی نوش کیا۔ حتیٰ کہ آخر میں میں نے تھوڑی سی چینی بھی پھانکی اور خدا کا شکر ادا کر کے بڑی فراغت سے ایک سگریٹ سلگایا۔

سگریٹ کے ابھی دو ہی کش لئے ہوں گے کہ میری دیرینہ رفیق چیونٹیاں پرے باندھ کر سامان پر حملہ آور ہو گئیں۔ آم، دودھ، چینی، بسکٹ کوئی چیز بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہی۔ پریشانی کے عالم میں میں نے ادھر دیکھا مگر وہاں یہ سامان رکھنے کیلئے کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے خدا کی زمین کے۔ اور یہ دیکھ دیکھ کر میری روح فنا ہوتی جا رہی تھی کہ چیونٹیاں بسکٹوں کی اندرونی تہوں تک پہنچ چکی تھیں۔ ایک بار تو میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ تمام بسکٹ ابھی کھا جاؤں کیونکہ یہ اس سے بہتر ہوگا کہ آٹھ روز میں چار بسکٹ میں کھاؤں اور بارہ یہ کھا جائیں۔ اس فیصلہ پر عمل تو نہ ہو سکا مگر اس سامان کو ان کی زد سے محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں کبھی اسے بغل میں رکھتا، کبھی سر پر اور کبھی بازوؤں میں لٹکا کر ٹہلتا مگر اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ نکلتا کہ چیونٹیاں میرے جسم تک پر یلغار کر دیتیں۔ تنگ آکر میں نے اسی طرح یہ جملہ سامان اپنی کوٹھری کے ایک کونے میں رکھ دیا اور اسے خدا اور چیونٹیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر میں دیر تک اس عجیب و غریب اور مضحکہ خیز پوزیشن کے بارے میں سوچتا رہا کہ میں اور حبیب ایک شہر میں ہیں اور ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ قانون ہمیں ملنے تک کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس بےرحم اور اندھے قانون نے نظر بندوں کے لئے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہی باقی نہیں رہنے دیا۔ دوست یار، عزیز کوئی بھی ملاقات نہیں کر سکتا

دیر تک میں اپنے خیالوں میں گم یہ سوچتا رہا کہ ملتان میں میرے کتنے عزیز دوست ہیں۔ خود حبیب کا گھر بالکل میرے اپنے گھر کی طرح ہے۔ حبیب کے والد، والدہ، بہنیں، بھائی اور دوسرے عزیز سب مجھے اپنے گھر کے فرد کی طرح چاہتے ہیں۔ مگر نہ وہ مجھے مل سکتے ہیں نہ میں ان سے، ان کے علاوہ اسی گھر میں بچپن کے اور کتنے دوست ہیں۔ صدیق جو مجھے ہمیشہ اس بات کا رعب دیتا ہے کہ ایک بار تیسری جماعت میں جب سکول کے لڑکے مجھے پیٹنے لگے تھے تو اس نے میری حفاظت کی تھی۔ مشتاق نذیر، بشیر اور وہ سارا گھر جس میں میں بڑی خوشی خوشی جایا کرتا تھا، آج مجھ سے اس قدر قریب ہو کر بھی اس قدر دور ہے۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ رات بھر میں اپنے ہمسائے پھانسی والوں کی باتیں سنتا رہا۔ اس ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں میں ان کی آوازوں سے شناسا ہو چکا تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن ان کی آواز کی کپکپاہٹ اور ان کے دل کی دھڑکن میرے اتنی قریب تھی کہ میں نے ان کی آوازوں کے ذریعہ اپنے ذہن میں ان کی الگ الگ شکلیں قائم کر لی تھیں۔

ان میں سے ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ رات رات بھر ماہیا گاتا۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا وہ گاتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی روح فریاد کناں ہے۔ وہ کسی لڑائی میں کسی عزیز کے قتل کے سلسلہ میں چودہ مہینے سے پھانسی کی کوٹھری میں بند تھا۔ دن رات اسی سیمنٹ کی بنی ہوئی پختہ فرش کی کوٹھری میں رہنا جس کے

درو دیوار پہ موت برس رہی ہو کتنا کٹھن کام ہے۔ یہ کچھ وہی جانتے ہیں جنہوں نے اس زندگی کو دیکھا ہو سیشن کی عدالت سے موت کی سزا ہونے کے بعد سے چودہ مہینوں وہ ہائیکورٹ، فیڈرل کورٹ اور رحم کی اپیلوں کے چکر میں تھا اور موت کے دروازہ پر زندگی کی امید کی ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع لئے اپنی قسمت کے فیصلہ کا منتظر تھا۔ اس کا نام غلام عیسےٰ تھا۔

اس کے ساتھ ہی تین اور قیدی بھی تھے۔ یہ تینوں ضلع مظفر گڑھ کے بلوچ تھے ان کی آوازیں باڑھ دار تھیں مگر موت کے دروازہ پر پہنچ کر ان آوازوں میں بھی ایسا سوز پیدا ہو گیا تھا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ایک کا نام جو غالباً سب سے بڑا تھا مرید خاں تھا۔ اس سے چھوٹا لال خاں اور اس سے چھوٹا نصیر خاں تھا۔ یہ تینوں بھائی ایک ہی قتل کے الزام میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال سے کوٹھریوں میں بند تھے۔

ان کے علاوہ ایک اور بھی تھا جس کی آواز اکثر آتی رہتی۔ وہ رات بھر گایا کرتا تھا۔ اس کی آواز اتنی کمزور، اسقدر معصوم اور فریاد سے پُر تھی کہ اس کا گانا سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ اکثر ماہیے کی یہ کلی گایا کرتا تھا ؎

اساں نتھنوں کی لیناں

فکر نہ کریں چن وے

سدا کوٹھیاں نہیں رہناں

کوٹھی جیل کی اصطلاح میں پھانسی کی کوٹھری کو کہتے ہیں۔ حیات محمد ایک سال سے

اس کوٹھی میں تھا اور اس امید میں تھا کہ ہمیشہ یہاں نہیں رہے گا۔

ان کے علاوہ تین چار اور تھے۔ ان میں ایک غلام محمد تھا جو طبعاً خاموش رہا کرتا تھا۔ وہ بہت نمازیں پڑھتا۔ قرآن شریف بھی پڑھتا۔ اسے ایک روز معلوم ہوا کہ میں سیّد ہوں تو اس نے ایک نمبردار کے ذریعہ مجھے یہ پیغام بھیجا کہ میں اس کی رہائی کے لئے دُعا کروں۔ اس کے بعد جب دوسروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی رات کو مجھے پکار پکار کر دُعا کرنے کے لئے کہا۔

میں ان سے کہنا تو چاہتا تھا کہ میری دُعا میں اثر ہوتا تو میں خود ہی کیوں یہاں پڑا سڑا کرتا۔ مگر ان کا دل توڑنا، انہیں امید کی اس ٹمٹماتی ہوئی شمع سے محروم کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ وہ سب موت کے دروازوں پر زندگی کے بھکاری تھے۔ ان میں سے بہت سے بے گناہ بھی ہوں گے۔ اور جو گنہگار بھی ہوں گے انہوں نے نہ معلوم کس اضطراری لمحے میں کس جذبہ سے مغلوب ہو کر قتل کیا ہوگا۔ ان کے اس اقدام کے پیچھے ان کی صدیوں پرانی جہالت تھی۔ ان کا غلط ماحول، ان کا غلط سماجی نظام اور غلط تربیت تھی۔ انہیں مجرم ٹھہرانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کے سب موت کے مسافر اور زندگی کے بھکاری میرے احاطے کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہر شام ان کو ایک کوٹھری سے دوسری میں تبدیل کر دیا جاتا۔ انہیں ایک دن سے زیادہ کسی کوٹھری میں مسلسل طور پر رہنے کی اجازت

اس لئے نہیں دی جاتی کہ کہیں وہ سرنگ وغیرہ لگانے کی کوشش نہ کریں۔ اس تبدیلی کو جیل میں اڑوی بدلنا کہتے ہیں۔ اڑوی بدلنے کی وجہ سے میری قریب ترین کوٹھریوں میں کسی شام مرید خاں ہوتا، کسی شام لال خاں اور کبھی حیات محمد یا نصیر اور غلام محمد ہوتے۔ جو بھی میرے قریب آتا وہ سب سے پہلے پکار کر مجھے سلام کہتا پھر فریاد کے لہجے میں کہتا "شاہ جی! دعا کرو مشکلیں آسان ہو جائیں"۔

اس رات غلام عیسے اور مرید خاں میرے آس پاس تھے۔ رات کے کوئی دس بجے جب جیل کی فضا مکمل طور پر پُراسرار اور خاموش تھی اور جیل کے ماحول کی سنگینی اپنے پورے عروج پر تھی، غلام عیسے نے مرید خاں کو پکارا۔

"مرید خاں!" اس نے کہا۔

"جی اوئے غلام عیسیا ـــــ" مرید خاں نے بڑے پیار سے جواب دیا۔

"مرید خاں دے حال؟"

"اللہ رحم کرے گا، اللہ فضل کرے گا۔ اللہ کوٹھیاں توڑے گا" مرید خاں نے مشین کی طرح یہ رٹے ہوئے فقرے دُہرا دیئے۔ جیسے ان کے علاوہ وہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ اپنے شعوری اور غیر شعوری اندیشوں کو دبانے کے لئے، اپنے آپ سے خوفزدہ وہ انہیں زور زور سے بول رہا تھا جیسے اگر اس نے یہ نہیں کیا تو معلوم نہیں کیا آفت آجائے گی۔ پھانسی والے سب اسی طرح بولتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے منہ سے ناامیدی کا اظہار نہیں کرتے۔ آخری دن تک، آخری وقت تک وہ امیدوں کے چراغ

روشن کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سنگدل کوٹھری کے پتھر پہ لیٹ کر وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نہ بچیں۔ مرید خاں بھی یہی کہہ رہا تھا۔ مگر آج غلام عیسے کی آواز میں بڑا ہی درد اور بڑا ہی کرب شامل تھا۔

میں اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے چاروں طرف موت نظر آتی تھی۔ تنہائی کی اس قید میں پھانسی والوں کے درمیان رہنے کی ذہنی اذیت میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنے دروازہ کے جنگلہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ غلام عیسے کہہ رہا تھا " مرید خاں! اب تو وارث تنگ آ گئے ہیں "

" اللہ رحم کرے گا " مرید خاں نے تیزی سے کہا۔

غلام عیسے تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے کہا " مرید خاں! میری بیوی کے زیور تو سیشن کی عدالت تک پہنچتے پہنچتے ہی بک گئے تھے۔ ہائیکورٹ اور فیڈرل کورٹ میں ہماری زمین بھی بک گئی۔ اب اگر میں بھی نہ رہا تو میری ماں، میرا باپ، بیوی اور دونوں بچے بھکاری ہو جائیں گے "

" غلام عیسے! اللہ رہائیاں دے گا۔ اللہ تقصیریں معاف کرے گا۔ دل نہ چھوڑ۔"

" میں دل تو نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ مگر مجھے اپنے گھر والوں کا بہت فکر ہے، مجھے اپنی بیوی کا اور بچوں کا خیال ہے "

مرید خاں اب کی بار چپ رہا۔ وہ خود اپنی زمین، اپنے بچوں اور اپنی بیوی کے

بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ اس ملک میں جہاں قانون اور انصاف فروخت ہوتا ہو جہاں لوگ انصاف حاصل کرنے کے لئے اپنی زمین، زیور، جائداد، سب کچھ فروخت کر دیتے ہوں وہاں مرنے والوں کے لئے لاکھوں اندیشے ہیں، ہزاروں غم ہیں۔ چنانچہ سب چُپ ہو گئے، حیات محمد خاموش ہو گیا تھا، مرید خاں خاموش ہو گیا تھا۔ غلام عیلے اور لال خاں اور نصیر اور غلام محمد سب خاموش تھے۔ اپنے اپنے اندیشوں میں، اپنے اپنے افکار میں سب کھو گئے اور فضا کی سنگینی اور سنگ دلی اور بھی بڑھ گئی۔

میں اپنے بستر پر دیر تک پڑا تڑپتا رہا۔ دیر تک اس وحشیانہ نظام، اس زندگی اس دنیا، اس قانون اور انصاف سے نفرت میرے اندر بڑھتی رہی۔ انسان کتنا عظیم ہے اور کس قدر حقیر ہے۔ آج بھی ظلم اور جبر اور طاقت کی حکومت ہے۔ آج بھی موت ہی سب سے زیادہ زور آور ہے اور کچھ نہیں۔

آدھی رات کی اس ساعت میں جب ہر طرف خاموشی تھی اور ہُمل اور سناٹا تھا اور میرے اردگرد کالی بھوری دیواریں اور کٹہرے اور تالے تھے۔ میں اپنی کوٹھری کے درمیان بیٹھا رو رہا تھا۔ اس روز میرا دل چاہتا تھا کہ میں ڈھاڑیں مار کر روؤں مگر میں نے ضبط کیا اور خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ بڑی دیر تک، ایک مدت تک، مجھے یوں معلوم ہوا گویا روتے روتے مجھے صدیاں بیت گئیں۔ دل بھر کر رونے کے بعد ذرا سا اطمینان ہوا۔ آج بھی میں سوچتا ہوں تو میری سمجھ میں

نہیں آتا کہ میں کیوں رویا تھا۔ ان آنکھوں میں جو مدتوں پہلے خشک ہو چکی تھیں، جن میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں نے کوئی نمی باقی نہ چھوڑی تھی، اتنے بہت سارے آنسو کہاں سے آ گئے تھے۔ ایک بچے کی طرح رونے کے لئے میرے پاس اتنا بڑا خزانہ کہاں سے آیا تھا۔ بہت ایمانداری سے بہت دیر تک سوچنے کے بعد بھی میں سمجھ نہیں سکا کہ میں کیوں رویا تھا لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں اس وقت اپنے دُکھ، اپنے غم اور اپنی تکلیف سے نہیں رویا تھا اس لئے کہ اپنی حد تک میں دکھوں کو برداشت کرنے کا عادی ہوں۔ میری زندگی نے اس سے بڑی مصیبتیں بھی دیکھیں مگر اس روز موت کے مسافروں کی آوازوں اور انسان کی بے بسی نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا۔ اس روز رونے کے بعد مجھے عجیب تجربہ ہوا۔ رونے میں دُکھ بھی تھا، تکلیف اور بے بسی کا احساس بھی تھا مگر اس میں ایک شدّت بھی تھی۔ میرا سارا کرب، سارا کھردرا پن اور ساری سختی گویا اس میں بہہ گئی تھی اور جب میں کافی دیر کے بعد آنسو پونچھ کر لیٹا تو مجھے اپنا جسم اور اپنی رُوح اس قدر ہلکی پھلکی، اتنی نازک اور معصوم معلوم ہوئی کہ خود میں حیرت میں آ گیا۔ اور مجھے یوں معلوم ہونے لگا گویا میں ایک خورد سال بچہ ہوں جسے اپنے تجربوں، اپنے احساسات اور اپنی ضدوں کے علاوہ اور کچھ بھی معلوم نہیں۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچتا سوچتا میں تکیہ پر سر رکھ کر نہ جانے کب سو گیا۔

اسی دورِ تنہائی میں میرے احاطے کے باہر بڑے بڑے زبردست لوگ موجود تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے بارے میں مجھے تفصیلات معلوم ہونے لگیں۔

کبھی کوئی سپاہی یا جمعدار افسروں کی نظر بچا کر میرے پاس آ بیٹھتا تو وہ کسی کی بات کر دیتا۔ کبھی رات کو گشت والا نمبردار پانچ منٹ کے لیے آ کھڑا ہوتا تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ اسی طرح مجھے اس کنوئیں میں غرق ہونے کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد کی دنیا کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت تھی۔

دوم تنہائی میں عام طور پر جیل کے مجرم یا خطرناک ڈاکو اور بے حد خطرناک مجرم رکھے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک اسلم کا نام بہت مشہور تھا۔ اپنے دروازے کی درزوں میں سے میں نے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ نوجوان سا لڑکا تھا مگر اس پر غالباً ستائیس مقدمے تھے۔ جیل کی اصطلاح میں وہ ابھی تک حوالاتی تھا کیونکہ اس کے خلاف سب مقدمے ابھی عدالت میں تھے۔ ایک دو مقدموں میں چار چار چھ چھ مہینہ کی سزا بھگتنے کے بعد وہ پھر حوالاتیوں کی فہرست میں آ شامل ہوا تھا۔ حوالاتی کو گھر کے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ جیل کے کپڑے اسی قیدی کو ملتے ہیں جسے عدالت نے سزا دے کر مجرم ٹھہرا دیا ہو۔ چنانچہ مقدمہ چلنے کے دوران میں حوالاتی اپنا لباس پہنتے ہیں۔ ان سے ہلکی مشقت پانی بھرنا، پوچا کرنا، جھاڑو دینا وغیرہ لی جاتی ہے۔ جیل کی اصل مشقت مونج کوٹنا، بان بٹنا یا کارخانہ میں کام کرنا سزا ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت اسلم حوالاتی تھا۔ وہ لٹھے کی سفید چادر

ململ کی قمیص اور تلّہ دار جوتی پہنے رہتا۔ وہ کوئی کام نہ کرتا تھا۔ جمعدار اور سپاہی ڈر کے مارے اس سے کام لینے کی بجائے اسے دوسرے حوالاتیوں کے کام کی نگرانی پر مامور کر دیتے تھے۔ کیونکہ یہ مشہور تھا کہ اسلم جس سپاہی یا جمعدار سے لڑ پڑتا ہے اسکی خیریت نہیں ہوتی۔ دشمنی نکالنے کے طریقے بھی اس کے اپنے تھے۔ مثلاً "جس جمعدار سے اسلم کو پرخاش ہوتی وہ اس کی ڈیوٹی کے عرصے میں کسی کوٹھری کا تالہ غائب کر دیتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی تالے کے پاس سے وہ گزر بھی جائے تو تالہ ٹوٹ کر گر پڑتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔" تالہ گم ہونے کی صورت میں جمعدار کو پانچ روپیہ جرمانہ ہوتا اور اس کا ریکارڈ بھی خراب ہو جاتا تھا جس سے اس کو ترقی ملنے کی امید ختم ہو جاتی۔

اسلم نے اسی طرح ایک دو جمعداروں کو سبق پڑھا کر سیدھا کر لیا تھا۔ اب وہ جیل میں لارڈوں کی طرح رہتا۔ کسی قیدی سے صابن لیتا، کسی دوسرے سے تیل حاصل کرتا اور کسی تیسرے کو اپنے کپڑے دھونے کا حکم دیتا۔ سگریٹ بیڑی بھی وہ نذرانہ کے طور پر وصول کرتا تھا اور مزے میں گزار رہا تھا۔

ایک روز آنکھ بچا کر وہ میرے دروازے کے باہر آ کر مجھے آواز دے کر سلام بھی کر گیا تھا اور جاتے ہوئے چائے کی پتّی بھی لے گیا تھا۔ میں نے چپ چاپ بڑی خوشی سے اسے پتّی دے دی۔ جمعدار نے اسے میرے دروازہ کے باہر کھڑا ہوا دیکھ تو لیا تھا مگر منہ دوسری طرف پھیر کر وہ بالکل انجان بن گیا۔

ایک اور بھی تھا

ایک اور قیدی بھی اسلم کی ہمسری کا دعویدار تھا - اس نے دو چار ڈاکے ڈالکر سات سال کی سزا حاصل کی تھی - اسلم ایک دن اس کو دروازہ کے باہر لا کر مجھ سے ملا گیا - یہ شخص بھی بہت آرام سے گذر کرتا تھا - میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا "پچانوے ہزار کے ڈاکے ڈالے تھے، پندرہ ہزار مقدموں پر خرچ ہوا، دس ہزار جیل کے افسروں سے مل کر ان کو کھلاؤں گا اور ساتھ ساتھ خود بھی یہاں بیٹھ کر کھاؤں گا - گھر والوں کے پاس ساٹھ ستر ہزار بچ رہے گا وہ بھی بے فکری سے دن کاٹیں گے - پانچ چھ سال کے بعد باہر جاؤں گا تو کچھ نہیں تو تیس چالیس ہزار تو باقی ہوگا، مزے سے ساری زندگی کٹ جائے گی"

مجھے چند دن بعد معلوم ہوا کہ جیل کے ڈاکٹر صاحب نے اس کے کارڈ پر ہلکی مشقت لکھ دی ہے اور اسے مریض بنا کر اس کا آدھ سیر دودھ لگایا ہوا ہے جب اس کا دل ہلکی مشقت کرنے کو بھی نہیں چاہتا تھا اس وقت وہ ٹہلتا ہوا ہسپتال جاتا - ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتا - وہ اس میں کوئی بیماری دریافت کرکے ہفتہ بھر کے لئے اس کی مشقت معاف کر دیتے - یا ہسپتال کا کھانا لگا دیتے اور ضرورت پڑتی تو اسے ہسپتال میں بھی داخل کر دیتے - یہ سب کچھ باقاعدہ ٹھیکہ پر ہوتا اور ٹھیکہ کی شرائط کی پابندی دونوں طرف سے ہوتی تھی -

تین چار مہینوں میں مجھے صرف اتنی باتیں معلوم ہو سکی تھیں، اور ان کی روشنی میں میں اپنے احاطہ میں تنہائی کی قید گزارتے ہوئے اکثر پیچ و تاب کھاتا ہوا یہ سوچتا کہ سیاسی قیدی ہونے کی بجائے کتنا اچھا ہوتا اگر میں کسی اخلاقی جرم میں آیا ہوتا۔ میں نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہوتا، یا اغوا کے مقدمہ میں ماخوذ ہوتا۔ اس صورت میں کم از کم میں اس بے رحم تنہائی سے تو بچا رہتا جو میری رُوح کو گھن لگا رہی تھی۔ ڈاکو اور خونی مجرم سب باہر تھے۔ اکٹھے تھے، وہ گاتے، ہنستے، کھیلتے اور میں اپنے دیوازوں کی درزوں میں سے رشک بھری نظروں سے ان کو دیکھا رہتا۔

اسلم اور وہ دوسرا ڈاکو کبھی کبھی نئے قیدیوں کو جمع کر کے انہیں اپنے معرکوں کی داستانیں سناتے۔ بیڑیاں پیتے، قہقہے لگاتے اور میں ان کو دیکھ دیکھ کر اس حسرت میں پڑا جلا کرتا کہ اور کچھ نہیں تو انہی میں شامل ہو سکتا۔

اتوار کو قیدیوں کو مشقت سے چھٹی ہوتی ہے۔ اس روز وہ کپڑے دھوتے ہیں، نہاتے ہیں اور گپ لڑاتے ہیں۔ اتوار کو جیل کا دفتر بند ہونے کی وجہ سے افسر لوگ بھی ایک دو چکر لگا کر گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اتوار کو عام طور پر جیل میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔

دوم تنہائی میں میرے احاطہ سے باہر، احاطہ کے دروازے کے سامنے اتوار کو عام طور پر مجلسِ موسیقی منعقد ہوتی۔ قیدیوں میں گانے والے بھی ہوتے ہیں۔ میراثی، نقلیے اور قوال سبھی جیل کی چار دیواری میں موجود ہوتے ہیں چنانچہ اتوار کو

قیدی جمعدار کے لئے ایک چٹائی بچھا کر اسے بٹھا دیتے اور کسی قوال کو پکڑ کر قوالی شروع کر دیتے۔ کوئی گھڑا بجاتا، کوئی ماہیا گاتا۔ پھر نقلیں ہوتیں، قیدی، جمعدار اور سپاہی سب محظوظ ہوتے۔ کچھ بھی ہو زندہ رہنے اور دل خوش کرنے کے لئے ان کے پاس لاکھ بہانے تھے اور یہ سب اس لئے تھے کہ وہ اکٹھے تھے، ایک ساتھ تھے، ایک میں تھا کہ ان کی ان دلچسپیوں میں بھی شریک نہ ہو سکتا تھا۔ بس دور ہی سے اپنے دروازے کی ننھی درزوں میں سے جھانک کر ان کو دیکھ لیتا اور پھر اپنی چٹائی پر آ بیٹھتا۔ میرے لئے اس تنہائی کا ایک ایک لمحہ صدیوں لمبا تھا۔ بعض اوقات کسی سے باتیں کئے ہفتوں گزر جاتے، کچھ کتابیں آ گئی تھیں انہیں پڑھتا لیکن پڑھتا مگر میرے اندر جو گھلاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ جذبات و احساسات کا جو طوفان امنڈا پڑتا تھا اسے قابو میں رکھنے کے لئے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں کچھ لکھنے کے لئے میری انگلیاں ٹوٹتی رہتیں۔ میں سوچتا اگر کچھ لکھنے کی اجازت ہی مل جائے تو وقت آسانی سے کٹ جائے مگر جیل کے افسروں سے بار بار درخواست کرنے کے باوجود مجھے کاغذ، قلم، دوات رکھنے کی اجازت نہ ملی۔ لاہور میں یہ معلوم ہوا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ اگر چاہے تو ایک کاپی صفحہ نمبر وغیرہ لگا کر دے سکتا ہے مگر جیل کا قانون اس قدر لچکدار ہوتا ہے کہ یہاں کے افسروں نے ایسے کسی قانون کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ بلکہ مجھے یہ بھی بتایا کہ نظربندوں کے پاس سے قلم یا کاغذ کا ٹکڑا برآمد ہونا بالکل ایسا ہی جرم ہے جیسے کسی کے پاس بغیر لائسنس کے پستول برآمد

ہو جائے۔ راجہ صاحب، ڈپٹی صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ نظربندوں کے پاس کاغذ، قلم، دوات وغیرہ ہو تو وہ جیل کے بارے میں کچھ لکھ کر باہر بھیج سکتے ہیں۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا کہ آپ صفحات پر نشان لگا کر مجھے دے دیجئے مگر انہوں نے میری ایک نہ مانی۔

کچھ جیل کے نظام کے بارے میں

جیل میں کیسے کام ہوتا ہے؟ جیل میں مجرموں کو رکھ کر ان کی اصلاح ہوتی ہے یا وہ زیادہ بگڑتے ہیں؟ اس موضوع پر دنیا بھر میں لوگ سوچتے اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ ہماری جیلوں کا جو نظام اور جو طریق کار ہے اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ملزم یا مجرم جب جیل لایا جاتا ہے تو اسے سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ وہاں پر اس کا وزن ہوتا ہے، اس کی مشقت اس کی صحت کے مطابق مقرر کی جاتی ہے اور پھر اسے جیل کے کسی ایک حصہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں دس ماہ کا عرصہ گزارنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جیل میں رشوت خوری کس عروج پر ہے۔

جو قیدی پہلی بار جیل میں آتے ہیں وہ تو بہت سختی برداشت کرتے ہیں لیکن جو عادی مجرم ہوتے ہیں وہ ایسے ڈھنگ سے سارا کاروبار بناتے ہیں کہ جیل میں

آکر وہ مزے سے اپنے دن پورے کرتے ہیں۔ عادی مجرم ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی دربان کو انگلیوں کے اشاروں سے بتا دیتے ہیں کہ وہ اتنی رقم بطور رشوت دے سکتے ہیں۔ دربان اور چکر جمعدار اس رقم کے مطابق اس کو جیل کے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں مثلاً کوئی لاوارث غریب ملزم یا پہلی دفعہ جیل آنے والا سیدھا دوم تنہائی جیسے سخت علاقے میں بھیج دیا جاتا تھا مگر جو قیدی پرانے اور دانایان راز میں سے تھے وہ کسی کھلی بارک میں بھیج دئے جاتے تھے۔ پھر ڈاکٹری معائنہ کے وقت وہ ڈاکٹر صاحب سے فیس طے کر لیتے اور ڈاکٹر صاحب دس پانچ روپے کا وعدہ لے کر ایک سو چالیس پونڈ وزن والے قیدی کا وزن اس کے کارڈ پر ایک سو پانچ پونڈ درج کر دیتے اور لکھ دیتے کہ وہ کمزور ہے اس لئے ہلکی مشقت دی جائے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پہلی بار آنے والا قیدی دس سیر مونج کوٹتا یا ایک سیر بان بٹتا اور عادی مجرم صرف جھاڑو دینے یا پانی اٹھانے کا کام کرتا۔ اس طرح پہلی بار آنے والا مجرم جب ان حقیقتوں سے آگاہ ہوتا تو وہ بھی یہی رویّہ اختیار کرتا۔ اور دوسری بار آنے کے لئے مکمل طور پر ہر سبق پڑھ کر تیار ہو جاتا۔ جیل سے جو ایک خوف اور ڈر کا پہلو ہے وہ ختم ہو جاتا تھا۔ ملتان جیل کے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تو مشہور تھا کہ وہ چونّی لے کر بھی قیدی کی مشقت ایک دو روز کے لئے معاف کرا دیتے ہیں۔

عادی مجرم پہلے دن جو شرائط طے کرتے تھے، وہ جلد از جلد پوری کر دیتے اور کسی سپاہی یا جیل کے ملازم کو اپنے کسی عزیز رشتہ دار یا دوست کے پاس بھیج کر اور اُسے

ایک دو روپے کا لالچ دے کر وہ مقرّرہ رقم منگوا لیتے تھے۔

جیل کے ملازم

جیل کے سبھی ملازم بے ایمان نہیں ہوتے، ویسے اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں ہوگا کہ بے ایمانی اور رشوت خوری کی سرحدیں پہلے پہل مفلسی سے شروع ہوتی ہیں جیل کے معمولی سپاہی کی تنخواہ پچاس روپے کی قریب ہے۔ ان کی نوکریاں اس قدر سخت اور ظالمانہ ہیں اور تنخواہ اس قدر قلیل ہے کہ وہ مجرموں سے خود کوئی کام حاصل کرنے تک کی کوشش کرتے ہیں۔ جیل کے وارڈر یا سپاہی آٹھ گھنٹہ دن میں اور تین گھنٹے رات میں نوکری دیتے ہیں اور اس کی نوعیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ انہیں ہر وقت نوکری سے برخواست کیا جا سکتا ہے۔ رات کی نوکری میں اکثر سپاہیوں کو تین تین گھنٹہ مستقل طور پر دوڑنا پڑتا ہے۔ جیل کی بڑی چار دیواری کی حفاظت جسے کورٹ موقعہ کہا جاتا ہے ان کے ذمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس چار دیواری کے دو دو فرلانگ لمبے ٹکڑوں پر ایک سپاہی کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ رات کو ڈیوڑھی سے لوہے کا ایک ٹکڑا نمبر لگا کر ایک سپاہی کو دیا جاتا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ کر دو فرلانگ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے سپاہی کو یہ ٹکڑا دیتا ہے۔ اگلا سپاہی اس ٹکڑے کو اس سے اگلے سپاہی کو دیتا ہے وہ اس سے اگلے کو۔ اس طرح یہ ٹکڑا چکر کاٹ کر پھر ڈیوڑھی پہنچ جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوا جمعدار یہ سمجھتا ہے کہ "سب اچھا"

ہے اور کام ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے۔ لمبے کے اس ٹکڑے کو پترا کہا جاتا ہے۔ پترا اگر ایک منٹ کے لئے رُک جائے تو فوراً پتہ کیا جاتا ہے، اگر کسی سپاہی کو غافل پایا جائے تو اس کی پیشی لگے روز سپرنٹنڈنٹ کے سامنے ہو جاتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اس جُرم میں سپاہی کو فوراً برخواست کر سکتا ہے۔

ڈیوڑھی کے پاس والے سپاہی کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ پترا اگلے سپاہی کو دیکر ایک منٹ کے اندر واپس ڈیوڑھی پہنچے اور دوسرا پترا لے لے۔ اس سے اگلے سپاہی کے ذمہ بھی یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح دو فرلانگ کی اس لمبائی کو سپاہی گھنٹے بھر میں ساٹھ دفعہ طے کرتا ہے۔ بوڑھے بوڑھے سپاہی دمہ اور کھانسی کے مارے ہوئے یہ غریب سردیوں اور بارش اور آندھی میں رات کو مسلسل بھاگتے رہتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا تھا کہ ان سپاہیوں سے تو پرانے اور عادی مجرم زیادہ آرام سے رہتے ہیں۔ پھر ان کو اس ظالمانہ نوکری کے بعد تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ اس زمانے میں اس تنخواہ میں ان کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ ہر ممکن بے ایمانی کرتے ہیں۔ محکمہ جیل کی طرف سے سپاہیوں کے لئے مولویوں کے ذریعہ اس تبلیغ کرانے کا انتظام تو کر دیا گیا ہے کہ وہ رشوت نہ لیں مگر محکمہ نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس قلیل تنخواہ میں ان کا گزارہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ملازموں کو بہتر تنخواہ دی جائے۔

جیل کے افسر اور ملازم

جیل کے افسروں کا عتاب بھی زیادہ تر سپاہیوں اور ملازموں ہی پر نازل ہوتا ہے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ اختیار ہے کہ وہ جب چاہے سپاہی کو برخواست کر دے۔ پکے ملازم تو ایسے حکم کی آئی جی کے پاس اپیل بھی کر سکتے ہیں مگر کچے ملازم کو اپیل کا حق بھی نہیں ہے۔

جیل کے افسر عام طور پر خطرناک مجرموں سے بچتے ہیں۔ کیونکہ بعض مجرم ایسے دل جلے ہوتے ہیں کہ وہ افسروں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں، انہیں گالیاں دیتے ہیں، ان کی بے عزتی بھی کر دیتے ہیں اور بعد میں اس کی سزا بھگتنے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں۔ ایسے مجرموں سے افسران عام طور پر بچتے ہیں اور ان کو Handle کرنے کا کام سپاہیوں اور جمعداروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن سپاہی اور ملازم اکڑ بھی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ ان کے خلاف فوراً ایکشن لیا جاتا ہے اور وہ فوراً برخواست کر دئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر ملازم اس قدر دبے ہوئے، اس قدر خستہ حالت میں نظر آتے ہیں کہ ان کو پناہ دینے والا سوائے قیدیوں کے اور کوئی نہیں ہوتا جن سے مل کر وہ ان کی ضروریات بھی پوری کرتے اور اپنی بھی۔

جیل میں جو اصلاح کی جاتی ہے اس کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک قیدی نے جو تین چار بار پہلے بھی جیل کاٹ چکا تھا مگر اب لاوارث تھا۔ ایک سپاہی سے ٹھیکہ

کیا ہوا تھا۔ یہ قیدی نقب زنی میں چھ مہینے کی سزا کاٹ رہا تھا۔ اسے افیم کھانے کی عادت تھی۔ پہلے جب بھی وہ پکڑا گیا اس کے ایک دو دوست اور رفیق کار اس کی ضروریات پوری کرتے رہے مگر اس بار اس کے یہ دوست بھی دھر لئے گئے تھے اور کسی اور جیل میں تھے۔ اس قیدی کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ کوئی گھر، کوئی زمین، مکان یا جائداد نہ تھی۔ روزگار نہ تھا۔ اس کے پاس بس ایک ہی فن تھا اور وہ تھا نقب زنی کا۔ وہ اسی کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر جیل میں آ کر وہ اپنے اس فن سے کام نہ لے سکتا تھا اور افیم کا عادی ہونے کی وجہ سے بری حالت میں تھا ـــــ لیکن دو چار روز میں اس نے ایک سپاہی سے ٹھیکہ کر لیا۔ ٹھیکہ کی شرائط یہ تھیں کہ سپاہی اسے چھ مہینے تک افیم اپنے پاس سے لا کر دیتا رہے گا اور قیدی رہا ہونے کے بعد جو پہلی چوری کرے گا اس کا سارا مال اس سپاہی کو دیگا۔ یہ شرائط تحریری نہیں تھیں تاہم دونوں پارٹیوں کو ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ چنانچہ سپاہی ہر پندرہ دن کے بعد اس کو آدھا تولہ افیم لا دیتا' اس امید پر کہ رہا ہونے کے بعد وہ کہیں نقب لگا کر اسے مال دیگا۔ وہ اکثر اٹھتے بیٹھتے یہ بھی کہتا۔ "اللہ نے چاہا تو اب ہمارے دن بھی پھر ہی جائیں گے" یہ تو مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے دن پھرے یا نہیں مگر مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ رہا ہونے کے بعد اس چور نے اپنی شرط ضرور پوری کی ہو گی۔ شرط پوری ہونے میں رکاوٹ بھی کیا ہو سکتی تھی جبکہ اسے یہ تحفظ بھی تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو پھر اسی جیل میں آ جائے گا جہاں اسے سنبھالنے والے قانون کے رکھوالے موجود تھے۔

اسی قیدی کو میں نے ایک روز اپنے دروازہ کے باہر ٹہلتا ہوا دیکھا تو میں بھی اپنے دروازہ کے پاس پہنچ گیا۔ جیل میں تعارف ہوتے دیر نہیں لگتی، میں اس کو پہچانتا تھا۔ وہ میرے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ بہر حال ہماری ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ دو چار تمہیدی فقروں کے بعد میں نے اس سے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"فیروزپور کے ضلع کا" اس نے کہا

"رہتے کہاں ہو؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"لاہور کے ضلع میں"

"پھر یہاں کیسے آکر پھنس گئے؟"

اس پر وہ مسکرایا اور بولا "بس شاہ جی تقدیر کھینچ لائی ہے، اپنا اصول تو یہ تھا کہ اکیلے چوری کرو۔ جس گاؤں میں میں رہتا تھا وہاں سے رات کو چپکے سے نکل جاتا تھا اور کہیں اپنا کام کر کے صبح سویرے واپس آجاتا تھا۔ دو تین چوریاں کر کے میں نے بکریاں خرید لی تھیں اور سوداگر بنا پھرتا تھا۔ مگر تقدیر خراب نکلی"

کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہا "میرے دو شاگرد ملتان کے ضلعے میں کام کرتے تھے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ ایک بڑا موٹا گھر دیکھا ہے مگر میرے بغیر کام نہیں چلے گا۔ ایک دو مہینہ تو ان کو ٹالتا رہا۔ آخر جب انہوں نے بہت مجبور کیا تو ان کے ساتھ چل پڑا اور رات کو یہاں آکر نقب لگا دیا"

"پھر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"اجی پھر کیا واقعی اتنا مال تھا کہ میں اٹھا نہ سکتا تھا۔ زیور اور نوٹوں کی پوری گٹھڑی میں نے باندھ لی اور اسے کندھے پر رکھ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ دس پندرہ آدمی اندر آ گئے اور میری ایسی تیسی پھر گئی"۔

"مگر یہ سب کیسے ہوا؟"

"شاگردوں کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے" اس نے کہا "میں نے ان کو باہر پہرہ دینے کے لئے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ سالے شوقین لونڈے صبر نہ کر سکے، سگریٹ سلگا کر پینے لگے اور نظر میں آ گئے۔ اور پھر جب لوگ انہیں دیکھ کر آ گئے تو اس طرح بھاگے کہ مجھے آواز بھی نہ دی"۔

ایک جمعدار کو آتے دیکھ کر وہ میرے دروازہ کے سامنے سے بھاگ گیا۔ میں بھی اپنی چٹائی پر آ بیٹھا۔

صاحبِ دل

اسی زمانے میں جیل والوں نے ایک سرنگ پکڑ لی۔ سرنگ لگانے والوں کا لیڈر اسلم تھا۔ اس نے دو تین آدمیوں سے مل کر کورٹ موقع سے کوئی پینتیس گز کے فاصلہ پر سے سرنگ کھودنا شروع کی۔ روزانہ تھوڑا سا وقت نکال کر یہ دو تین آدمی تھوڑی سی سرنگ کھود آتے اور اندر ہی اندر کچھ قیدیوں کو اپنے ساتھ بھگا لیجانے کیلئے

تیار بھی کرتے رہے تھے۔ سرنگ انہوں نے ایک دیوار کی آڑ سے شروع کی تھی چنانچہ کافی دنوں تک اور کافی لمبی سرنگ کھودنے تک کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سرنگ لگانے والوں کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اس کی مٹی بھی کسی طریقہ سے اندر ہی کھپا ڈالی تھی۔ یہ بھی سُنا جاتا تھا کہ انہوں نے اپنے ساتھ بھگا لے جانے والے کوئی پچاس آدمی تیار کر لئے تھے۔

کہا جاتا تھا کہ سرنگ جیل کی حدود سے باہر نکلنے ہی والی تھی کہ یہ لوگ پکڑے گئے۔ چنانچہ انہیں فوراً بیڑیاں پہنا کر چکی بند کر دیا گیا۔

کئی روز یہ لوگ بند رہے۔ میں اپنے دروازہ کی درزوں میں سے بھی ان کو نہ دیکھ سکا۔ ایک روز میں بیڑی کی آواز سُن کر دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا اور باہر جھانکنے لگا۔ بیڑی پہننے والا اسلم تھا جو میرے دروازہ کے باہر قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی یا کسی قسم کا کوئی فکر نہ تھا۔

میں نے مذاقاً اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اوئے اسلم! تو نے اتنے قیدیوں کو جیل سے نکالنے کا پروگرام بنایا تھا، مجھے اس پروگرام میں کیوں نہ شریک کیا ہ؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "شاہ جی! قسمت چکر کھا گئی ورنہ اس وقت ہم باہر ہوتے اور سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یہی بیڑیاں پہنے آپ کے سامنے پھرتے نظر آتے"

یہ مفصل اور حوصلہ مندانہ جواب سُن کر میں دنگ رہ گیا۔ اسلم بالکل مطمئن کھڑا تھا۔ مجھے اس جیل میں آئے ہوئے تقریباً اڑھائی تین مہینے گزر چکے تھے۔ یہ سارا عرصہ قیدِ تنہائی میں گزرا تھا۔ کبھی کوئی قیدی جمعداروں اور جیل کے ملازموں کی آنکھ بچا کر میرے دروازے کے باہر جو ہر وقت مقفل رہتا تھا، آ کھڑا ہوتا تو اس سے کوئی بات ہو جاتی ورنہ عام طور پر ہفتوں مجھے کسی سے بات کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوتی۔ صبح کے وقت چند حوالاتی احاطہ صاف کرنے کے لئے آتے پانچ منٹ کے لئے دروازہ کھل جاتا۔ وہ چلے جاتے تو دروازہ بند ہو جاتا۔ اسی طرح صبح شام بھنگی اور لانگری کے آنے پر چند منٹ کے لئے دروازہ کھلتا اور پھر بند ہو جاتا۔ دوسرے تیسرے روز راجہ صاحب شام کے وقت چکر لگاتے اور چند منٹ کے لئے اِدھر اُدھر کی گپیں ہانک کر چلے جاتے۔ کبھی کبھار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی آ جاتے۔ اب ان کا رویّہ بہت بدل گیا تھا۔ تصنع اور ریاکاری کا جو خول انہوں نے اپنے فرائض کی صورت میں اپنے اوپر چڑھایا ہوا تھا اس میں سے اب مجھے ان کی اصل شکل وصورت اور اصلی طبیعت کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ میری کوئی بات تو نہ مانتے تھے مگر ان سے بات چیت کے دو چار مواقع حاصل ہونے کے بعد مجھے ان سے مل کر خوشی ہونے لگی کیونکہ ان کا مبلغ علم جیل کے عام افسروں سے بہت زیادہ تھا۔ بیس سال تک اس غیر انسانی ماحول اور اس محکمہ کی نوکری کرنے کے باوجود انہوں نے کچھ کھویا نہیں تھا۔ لٹریچر، ادب، شاعری، سیاست اور اخباری معاملات

کے بارے میں وہ بے تکان اور بہت اچھی گفتگو کرتے تھے۔ اب مجھے ان کا انتظار رہتا تھا۔

میرے مطالبات پر وہ ہمیشہ طرح دے کر مجھے دھوکا دینے اور ٹالنے کی کوشش کرتے۔ عام طور پر وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ میری بڑی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر نوکری سے مجبور ہیں اس لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں ان کی باتوں سے ان کا مفہوم صاف سمجھ جاتا مگر ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا جادو مجھ پر چل گیا ہے اور میں سمجھتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح گذارنی ہے، اسے ہنس کر گزاروں یا رو کر، گزارنی بہرحال ہے۔

اس دو تین مہینے کے عرصے میں میری صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ قیدِ تنہائی میں رہنے اور خاص طور پر پھانسی والوں کے درمیان رہنے کی وجہ سے میں بیک وقت جسمانی اور ذہنی اذیتوں میں مبتلا تھا اور اس کا اثر میری صحت پر بھی پڑ رہا تھا۔ میں نے اس سارے عرصے میں باہر سونے کی اجازت حاصل کرنے، خود کھانا پکانے اور اس تنہائی سے نجات حاصل کرنے کی اجازت لینے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ ڈپٹی صاحب اور راجہ صاحب بہت مہربانی سے پیش آتے تھے مگر میری کسی جائز بات کو بھی ماننے کے سلسلے میں صاف انکار بھی نہ کرتے اور 'ہاں' بھی نہیں کہتے تھے۔ مثلاً میں جس کوٹھری میں بند کیا جاتا تھا اس میں بجلی کا بٹن اور کنکشن وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ صرف ایک گز لمبی تار لگا کر، جو کسی وجہ سے کٹ گئی تھی، مجھے بجلی مل سکتی تھی۔ میں

کئی ماہ تک ان حضرات سے لالٹین کی مدھم اور ناکافی روشنی کی شکایت کر کے بجلی حاصل کرنے کی درخواست کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے رہے مگر اتنا معمولی کام تک بھی انہوں نے کر کے نہیں دیا۔ پہلے دن تو انہوں نے کہا کہ جیل کا بجلی والا ملازم چھٹی گیا ہوا ہے، واپس آئے گا تو دس منٹ میں یہ کام ہو جائے گا۔ دو چار روز کے بعد یاد دہانی پر انہوں نے فرمایا کہ اس کے لئے بجلی کے محکمہ سے اجازت حاصل کرنی پڑے گی۔ یہ بات غلط تھی مگر میں نے تکلف میں ان سے اجازت حاصل کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے فوراً منظور کی اور بتایا کہ بجلی والوں کو چٹھی لکھ دی گئی ہے۔

اس چٹھی کا مزید تین چار ماہ تک جواب نہیں آیا۔ کیونکہ چٹھی لکھی ہی نہیں گئی تھی آخر ایک دن آئی جی کے دورے سے پہلے بغیر کسی چٹھی کے انہوں نے مجھے بجلی دیدی اس کام میں بہر حال ساڑھے چھ ماہ خرچ ہوئے۔

تین چار ماہ میں میں کسی نہ کسی طرح اس زندگی کا عادی بھی ہو گیا تھا۔ ضروریات کی تمام چیزیں حبیب پاسلوی بھیج دیا کرتا تھا اس لئے اس طرف سے اطمینان تھا۔ کتابیں گھر سے آگئی تھیں اور اخبار جیل سے مل جایا کرتے تھے۔ کتابیں اور اخبار چاٹ چاٹ کر میں تنہائی کا یہ وقت گزارتا تھا جو کسی طرح گزرنے میں نہ آتا تھا۔ میں نے زمانۂ قدیم کے باشندوں کی طرح سائے کے حساب سے اپنے اوقات مقرر کر لئے تھے دوپہر کو اپنی کوٹھری میں لیٹے لیٹے میں درجنوں بار اٹھ کر مغربی سایوں کو دیکھتا، اور

ڈھلتی ہوئی دھوپ سے اندازہ لگا کر چائے کے وقت کا انتظار کرتا۔ اپنے اوپر خود ہی یہ احتساب عائد کر کے میں نے اس زندگی میں بھی نظم وضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سامان اتنا نہیں ہوتا تھا کہ میں صبح شام کی چائے کے علاوہ بھی چائے پی سکوں۔ اس لیئے میں چائے کے وقت کی پابندی کرتا تھا اور اس وقت کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔

یہ خیال مجھے بار بار تنگ کرتا رہتا کہ اسی جیل کی چار دیواری میں میرا ایک رفیق حسن عابدی بھی ہے، اسے اگرچہ بہتر کلاس مل ہوئی تھی مگر یہاں پر اس کا والی وارث کوئی نہیں ہے۔ کھانے اور چائے کا سامان تو اسے جیل سے مل جاتا ہو گا مگر سگریٹ صابن، یا کوئی اور چیز جو باہر سے آ سکتی تھی وہ اسے کبھی نہ ملتی ہو گی۔ نہ کوئی اس کی ملاقات کرنے والا تھا نہ کوئی اسے سامان بھیجنے والا تھا۔ حجامت بنانے تک کا سامان بھی اس غریب کے پاس موجود نہ تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکتے پھر وہ جیل کے دوسرے انتہائی گوشے میں تھا، مجھے اس کی کوئی خبر، کوئی اطلاع نہیں ملتی تھی۔ بس اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ ہے اسی جیل میں، کئی بار میں نے افسروں سے درخواست کی کہ ہمیں ایک ساتھ رکھا جائے لیکن میری درخواست ہمیشہ یہ کہہ کر ٹھکرائی جاتی رہی کہ حکومت یعنی پولیس کے احکامات ہی یہ ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے۔

اسی زمانے میں ایک روز ڈپٹی صاحب ٹہلتے ہوئے میرے غریب خانہ کی طرف

آ نکلے تو میں نے ان سے اخبار باقاعدہ نہ ملنے کی شکایت کی اور کہا "اخبار دینے میں بھی بے قاعدگی اختیار کرنے کے معاملہ میں حکومت کے کوئی احکامات نہیں ہیں اس لئے اخبارات ہی باقاعدگی سے ملتے رہیں تو آپ کی بڑی عنایت ہوگی"

ڈپٹی صاحب اس فقرے سے محظوظ ہوئے ویسے ان کی مزاح کی حس کافی تیز تھی اور اس روز تو وہ بہت اچھے موڈ میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ کل سے وہ جیل میں قیدیوں کو پڑھانے کے لئے جو ماسٹر صاحب مقرر ہیں ان کی ڈیوٹی لگا دیں گے کہ وہ باقاعدہ مجھے اخبار پہنچاتے رہیں۔ یہی ماسٹر صاحب جیل کی لائبریری کے انچارج بھی تھے۔

ڈپٹی صاحب رخصت ہونے لگے تو میں نے ان سے پوچھا کہ "جیل کے محکمہ میں رہنے کے باوجود ان کی خوش ذوقی کیسے قائم رہ گئی اور یہ کہ اس محکمہ میں نوکری کرنے کے باوجود اپنے شستہ ذوق کو قائم رکھنا بڑے حوصلہ کا کام ہے"

میں اس روز تنہائی سے بہت زچ ہو گیا تھا اور انہیں کسی بہانے سے روک کر "باتیں کرنے" کی عادت پوری کر رہا تھا۔ حقیقتاً مجھے ان کے ذوق کے متعلق ہمیشہ تعجب ہوتا تھا۔ اس وقت موقعہ پا کر میں نے ان سے صاف صاف پوچھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگے "میرا اصل حوصلہ یہ نہیں ہے کہ میں ایسے حالات میں اپنی ان عادتوں کو کیسے برقرار رکھ رہا ہوں۔ میرا اصل حوصلہ تو یہ ہے کہ میں جس قسم کے گھر میں رہتا ہوں اس میں رہ کر بھی زندہ ہوں۔ جو آدمی میری بیوی کو جانتے ہیں، تعجب تو ان کو ہونا چاہیے کہ

میرے جیسا آدمی اس کے ساتھ نباہ کیئے جا رہا ہے۔ میرا اصل حوصلہ تو یہ ہے۔"

یہ بات انہوں نے ہنستے ہوئے کہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھر سے پریشان ہو کر یا لڑ جھگڑ کر آئے ہیں۔ کافی عیال دار آدمی تھے اس لئے لڑائی جھگڑا ہونے کی بھی نوبت آسانی سے آسکتی تھی مگر اس روز ان کی یہ بات سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے اس غیر فطری معاشرہ میں کوئی بھی آدمی اپنی صحیح جگہ پر نہیں ہے۔ یہ ڈپٹی صاحب جن کا نام شیخ محمد شریف ہے اگر کسی شرافت کی نوکری پر ہوتے تو شاید اس سے کہیں بہتر کام کر سکتے جو وہ یہاں کر رہے ہیں۔ پھر وہ تو تھے بھی بڑے باغ و بہار آدمی ہمیشہ ہنستے رہتے اور جب نوکری کی وجہ سے ہنسی کی بجائے چہرے پر خشونت کے آثار پیدا کرتے تو فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ مجبوراً یہ کام کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ گھلنے ملنے کے بعد مجھے ان کی شخصیت کے کئی اور اچھے اور بہتر پہلو دکھائی دیئے مگر بدقسمتی سے ان کی افسری ان کی تمام خوبیوں پر غالب آئی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود انہوں نے اس نوکری کی وجہ سے اپنی صورت مسخ کر لی تھی اور اب اسی ڈھرے پر چل نکلے تھے جس پر چلنے کے لئے وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ناموزوں آدمی تھے۔

ماسٹر صاحب

اگلی صبح ڈپٹی صاحب ایک دبلے پتلے مخنی سے آدمی کو اپنے ساتھ لئے میرے

احاطہ میں داخل ہوئے۔ یہ شخص اس قدر خستہ حال، کمزور اور ناتواں نظر آ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا، ہوا کے جھونکے سے ابھی اُڑ جائے گا اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائینگے۔

اس کی عمر تو کچھ زیادہ نظر نہ آتی تھی مگر اس کا چہرہ ان تمام مصیبتوں اور آفاتِ ارضی وسماوی کا آئینہ دار تھا جو اس جانِ ناتواں پر نازل ہوتی رہی ہوں گی۔ پہلی ہی نظر میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ وہی ماسٹر صاحب ہیں جن کے بارے میں اگلے روز شیخ صاحب ذکر کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بتا بھی دیا کہ "یہ ماسٹر صاحب ہیں جو جیل کے ملازم ہیں۔ ان کا کام قیدیوں کو حرف شناسی کرانا ہے۔ یہ مجھے آئندہ اخبار باقاعدگی سے پہنچاتے رہیں گے اور اگر تنہائی کی وجہ سے میں کبھی بیہوش ہونے کے قریب پہنچ جاؤں تو یہ میرے پاس دو چار منٹ کے لئے بیٹھ بھی جایا کریں گے"

ماسٹر صاحب اس سے اگلے دن صبح کوئی نو بجے کے قریب دروازے میں سے نمودار ہوئے اور دہلیز پر کھڑے ہو کر انھوں نے اخبار میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے ان سے کہا "قبلہ! میں تنہائی کی وجہ سے بے ہوش ہونے والا ہوں اس لئے ڈپٹی صاحب کے حکم کے مطابق آپ دو چار منٹ کے لئے میرے پاس بیٹھ جائیں"

وہ کچھ جھجکتے ہوئے، شرماتے لجاتے ہوئے، اپنے آپ ہی سے شرمندہ دو قدم آگے بڑھے۔ میں بھی دو قدم ان سے ہاتھ ملانے کے لئے بڑھا مگر وہ گھبرا کر پھر پیچھے ہٹ گئے۔

دو منٹ تک وہ اسی طرح کھڑے رہے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈر کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک جمعدار پاس سے گزرا تو انھوں نے بڑی رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھ کر فرمایا "دیکھا یہ جمعدار گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اب یہ جا کر رپورٹ کر دے گا کہ یہ ماسٹر نظربند سے باتیں کر رہا تھا۔ اس لئے میں اب چلتا ہوں، پھر حاضر ہوں گا"

ماسٹر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ ڈپٹی صاحب نے کمال فراخدلی سے اس شخص کو مجھے اخبار پہنچانے کی اجازت کیوں دے دی ہے۔ غالباً انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ماسٹر صاحب دنیا بھر میں بےضرر ترین آدمی ہیں۔

اس روز کے بعد سے آہستہ آہستہ میں نے ماسٹر صاحب کو اپنے پاس دو چار منٹ بٹھانے کی عادت توڑ ڈالی، وہ بیٹھ تو جاتے تھے مگر نوکری سمجھ کر، اور ہمیشہ گھبرائے ہوئے اور مجوب سے نظر آتے۔

ماسٹر صاحب ایک شریف النفس، مجہول، مسکین اور فاتر العقل انسان تھے وہ دنیا بھر سے شاکی تھے۔ حالات، افسران، حتیٰ کہ جمعداروں اور سپاہیوں سے بھی وہ ڈرتے رہتے تھے جو ان سے آدھی تنخواہ لیتے تھے۔ ان کی شرافت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی میں ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے محض عادتاً ان سے کہتا کہ حکومت نے

مجھے سیاسی نظر بند ہونے کے باوجود جانوروں کی طرح رکھا ہوا ہے" تو وہ جھٹ سے فرما دیتے "جی ہاں! مگر شکر کیجئے کہ آپ کو اخبار مل جاتا ہے۔ اگر وہ بھی بند کر دیں تو آپ ان کا کیا کر سکتے ہیں۔ جی ہاں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں"

کبھی میں ان سے کہتا "کھانا اچھا نہیں ملتا۔ صحت خراب ہو رہی ہے" تو وہ جواب دیتے "جی ہاں کھانا تو بہت خراب ہے مگر خدا کا شکر ادا کیجئے کہ کھانا آپ کو مل تو رہا ہے، اگر وہ کھانا بند ہی کر دیں یا ایک ہی وقت دیا کریں یا کم دیا کریں تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔ بابا وہ حاکم ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ان سے سب کچھ بچ ہے"

میری حالتِ زار اور قیدِ تنہائی کی اذیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میں پہروں ان ماسٹر صاحب کا انتظار کرتا رہتا اور اگر کسی دن وہ تشریف نہ لاتے تو میں اس طرح بیقرار رہتا گویا کوئی معشوق وعدہ کر کے مجھ سے ملنے نہیں آیا۔

ماسٹر صاحب ہمیشہ غائب دماغ بھی رہتے تھے۔ وہ باتیں کرتے تو ایک ہی منٹ میں کہیں سے کہیں نکل جاتے اور پھر ایکدم سے چپ ہو کر منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے ہنسی تو بہت آتی مگر میں ہنسی کو پی جاتا اور گفتگو شروع کرنے کی کوشش کرتا "ماسٹر صاحب اب تو موسم تبدیل ہو رہا ہے"

"اچھا؟" وہ بڑا سا منہ کھول کر نہایت حیرت بھرے لہجے میں کہتے۔ دراصل وہ بغیر بات سُنے اور سمجھے اپنی ہی دُھن میں منہ کھول دیتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے میں

ان کی ان حرکتوں سے محظوظ بھی نہ ہو سکتا تھا میرا ہمیشہ جی چاہتا تھا کہ انہیں کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلاؤں اور پھر اپنی بات کہوں۔

حوالاتی اور دفعہ ۱۰۹

صبح سویرے حوالات کے منشی پوچا کرنے کے لئے میرے احاطے میں روزانہ آتے تھے۔ اب مجھے اس جیل میں آئے کافی مدت ہو چکی تھی اور جمعدار، ملازم اور افسر تک میری شرافت کے قائل ہو چکے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی جمعدار احاطہ کا تالہ کھول کر اور حوالاتیوں کو پوچا کرنے، جھاڑو دینے کی ہدایات دے کر ادھر ادھر کسی اور کام سے نکل جاتے۔ ویسے جمعداروں کی موجودگی میں بھی میں حوالاتیوں سے کبھی کبھار بات چیت کر لیتا تو وہ اب زیادہ تعرض نہ کرتے تھے۔

اس سارے عرصے میں پچاس فیصدی سے زیادہ حوالاتی پوچھنے پر یہی بتاتے رہے کہ وہ دفعہ ایک سو نو یعنی آوارہ گردی میں پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ جیل میں رہ کر مجھے ایسا معلوم ہونے لگا تھا گویا پوری قوم آوارہ گردی کی طرف مائل ہے، جسے دیکھو آوارہ گردی میں چلا آ رہا ہے۔ روزانہ دس بیس آدمی اس جرم میں پکڑ کر اندر بھیج دیئے جاتے تھے۔

کافی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ جرائم کی رفتار بڑھنے پر حکومت محکمہ پولیس کو ہشیار رہنے کی تاکید کرتی ہے۔ پولیس کے افسران ماتحتوں کو ڈانٹتے ہیں اور ماتحت

تھانیدار وغیرہ جرائم کے سدّباب کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ جس پر بھی شک ہوا پکڑ کر اندر ڈال دیا۔ کسوٹی یہ مقرر کر لی جاتی ہے کہ جو آدمی حقیقتاً آوارہ گرد نہیں ہوگا اسکی ضمانت دینے والے آجائیں گے، جن کی ضمانت نہ ہوگی وہ یقیناً آوارہ گرد ہونگے۔ ان کو عدالت سے سزا ہو جائے گی جو دو ماہ سے چھ ماہ تک کے عرصے کے لئے ہوتی ہے۔

جرائم کے سدّباب کا یہ طریقہ حکومت کے ان دوسرے کارناموں میں سے ایک ہے جن کو وہ بغیر سوچے سمجھے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ یہ کرم فرما اتنا نہیں سوچتے کہ جرائم کیوں بڑھ رہے ہیں۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ملک میں جوں جوں بے روزگاری اور کساد بازاری بڑھتی ہے، جوں جوں لوگوں کی قوتِ خرید کم اور ضروریاتِ زندگی گراں ہوتی ہیں، جرائم بڑھتے ہیں۔ ان کی جڑ اس معاشرہ میں ہے جو مجرم پیدا کرتا ہے، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرنا اور جرائم کم کرنے کے سلیمانی طریقے دریافت کرنے کے لئے سب موجود رہتے ہیں۔

اس ضمانت والے طریقہ میں بھی یہی ہوتا کہ جو لوگ نسبتاً خوش حال اور کھاتے پیتے ہوتے ہیں ان کے ضامن آجاتے ہیں مگر لاوارث، غریب، پردیسی اور مہاجر لوگ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے حوالاتی تھے جو روتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم غریب مہاجر ہیں ہماری ضمانت بھلا یہاں پر کون دے گا؟

ایک بڈھے کو میں کبھی نہیں بھولوں گا جو میرے احاطہ کی دہلیز کے ساتھ لگا بیٹھا اس طرح رو رہا تھا اور اتنے بڑے بڑے آنسو بہا رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ابھی ان آنسوؤں میں پگھل کر بہ جائے گا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ دو روز سے یہاں ہے اور آج اس کی لڑکی کی شادی کی تاریخ ہے۔ اس ضعیف العمر غریب کسان نے ہچکیوں کے درمیان یہ کہا کہ وہ خانیوال کی تحصیل میں کسی گاؤں میں رہتا ہے، مشرقی پنجاب کا مہاجر ہے اپنی جوان بیٹی کی شادی کے موقعہ پر وہ تحصیل لودھراں میں اپنے ان چند رشتہ داروں کے پاس انہیں لینے کے لئے جا رہا تھا جو ان سے ناراض ہونے کی وجہ سے اس شادی میں شرکت نہیں کر رہے تھے۔ سفر کے دوران ہی میں پولیس والوں نے اسے ملتان سٹیشن پر آوارہ گردی میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور اپنا کوٹہ پورا کر کے اور جرائم کا سدِّباب کر کے بڑے اطمینان سے گھر چلے گئے مگر اس بے چارے کی دنیا برباد ہو گئی۔ وہ اس طرح رو رہا تھا کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا کوئی ضامن نہیں ہے، اسے کسی پر یہ امید نہیں ہے کہ وہ اس کی ضمانت دے گا۔ اسے تو صرف یہ فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے گھر اطلاع پہنچا دے۔

اطلاع پہنچانے کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی۔ اور وہ یہ کہ وہ کارڈ لکھ کر اپنے گھر اطلاع دیدے کہ وہ اس طرح پکڑا گیا ہے۔ مگر جیل میں ہر اخلاقی قیدی کو

مہینہ میں ایک کارڈ لکھنے کی جو اجازت ہوتی ہے اُس کی صورت بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قیدی کے لئے ضروری ہے کہ وہ پریڈ کے دن (جو ہفتہ میں ایک ہوتا ہے) سپرنٹنڈنٹ صاحب سے سوال یعنی درخواست کرے کہ وہ اسے کارڈ لکھنے کی اجازت دیدیں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی اجازت ملنے کے بعد اس علاقے کے منشی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ڈیوڑھی سے کارڈ لے کر لکھے اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ کر دے۔ روانہ کرنے سے پہلے تمام کارڈ ڈیوڑھی میں جاتے ہیں، جہاں جیل کے افسر انہیں پڑھ کر سنسر کرتے ہیں۔ اس سنسر بازی کے لئے خطوط ہفتوں ان کے پاس پڑے رہتے ہیں تب کہیں جا کر یہ روانہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات روانہ کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر پھینک بھی دئے جاتے ہیں۔

اب یہ غریب بڈھا پہلے تو پانچ روز تک، سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورہ کا انتظار کرتا۔ ان کی اجازت ہوتی تو منشی صاحب کے رحم و کرم پر دو چار یا چھ روز تک پڑا رہتا اور پھر اُس کا کارڈ ڈیوڑھی پہنچتا جہاں سے کہیں مہینہ بھر کے بعد وہ روانہ کیا جاتا۔

یہ سارا معاملہ سوچ کر میں اس غریب بڈھے اور اس کے گھر والوں کی تقدیر کے بارے میں غور کرتا رہا اور اس کی اس جوان بیٹی کی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا جو ہاتھوں میں مہندی لگائے اپنے باپ کے انتظار میں بیٹھی ہوگی اور اسے اتنا بھی

پتہ نہ چل سکے گا کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مر گیا۔

مگر قانون کے محافظوں کو اس غریب بڈھے یا اس کے خاندان یا اسکی بیٹی کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ ان کی ایک معمولی جنبش قلم سے ایک غریب گھر برباد ہو رہا ہے، ایک دنیا اجڑ رہی ہے، ایک خاندان جو پہلے ہی سے تباہ حال ہے اور بھی تباہ ہو جائے گا۔ انہیں تو قانون چلانے، قانون بنانے اور قانون استعمال کرنے سے غرض تھی۔ اس قانون کا وار کس پر پڑتا ہے، اس کی کاٹ کتنی گہری، کتنی شدید اور کسقدر خوفناک ہے، اس سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔

کتنی انوکھی تھی یہ دنیا، کتنے ظالمانہ تھے یہ قانون اور کتنے دکھی اور غمگین انسان اس چار دیواری میں محبوس تھے۔ ہماری معاشرت اور ہمارے سماج میں غریب انسان کو کتنے جانگداز امتحانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ جیل ہی میں پہنچ کر ہو سکتا ہے۔ جہاں انسانوں کو پکڑ پکڑ کر تالوں اور کٹھڑوں اور زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ خرابی کہاں پر ہے؟

اس چار پانچ سال کے عرصے میں حکومت نے ایک ہی کام سیکھا تھا کہ اس خرابی، اس ظلم اور جبر کے خلاف جہاں سے آواز بلند ہوتی ہے اسے ختم کرنے کی کوشش کرو۔ اس آواز کو دبا دو۔ کاش وہ اتنا سوچتے کہ یہ آواز کہاں سے اور کیونکر بلند ہو رہی ہے۔

اس شام میری طبیعت بے حد افسردہ تھی، عجیب بے کلی اور بے بسی کے عالم میں میں اپنے احاطے میں ٹہلتا رہا۔ کھانا کھانے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ باہر سے رونے کی آواز آنے لگی۔ رونا کیا تھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا کوئی آدمی درد سے چنگھاڑ رہا ہے۔ آواز کافی دور سے آ رہی تھی مگر اس کی ایک ہی لہر نے مجھے لرزا دیا میں بھاگ کر دروازہ کے پاس پہنچا۔ دروازہ تھپتھپا کر میں نے جمعدار کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ یہ رونے کی آواز کیسی ہے؟

اس نے مسکراتے ہوئے لاپرواہی سے کہا "اُدھر ڈیوڑھی کے پاس کسی کو بید زنی کی سزا مل رہی ہے"

یہ سن کر مجھ میں کھانا کھانے کی تاب بھی باقی نہیں رہی اور میں چپ چاپ اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ گیا اور اپنی زندگی اور اپنے ساتھی دوسرے قیدیوں کی زندگی کے بارے میں دیر تک پڑا سوچتا رہا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

معمولات

آہستہ آہستہ میری زندگی ایک ڈھرے پر آ گئی۔ میں نے یہاں پر بھی اپنے معمولات مقرر کر لئے۔ انہی دنوں مجھے باہر سے جو کتابیں آئیں ان میں ایک کتاب یوگا کے متعلق بھی تھی چنانچہ اس کتاب کو پڑھ کر میں نے یوگیوں کے ورزشی آسن یاد

کر لئے۔ صبح سویرے اُٹھ کر میں سمادھی لگا کر اور آنکھیں بند کر کے آدھ گھنٹہ بیٹھا رہتا اور صبح سویرے کا وقت گیان دھیان میں صرف کرتا۔ صبح کا اصلی تصور تو میرے ذہن سے بھی مٹ گیا تھا۔ پو کیسے پھٹتی ہے، مشرق سے سورج کی کرنیں کیسے نمودار ہوتی ہیں اور کارگہِ عالم میں سورج کس طرح اپنی ضیا پاشیاں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ تو مجھے بھول گیا تھا۔ اس لئے میں نے گیان دھیان اور یوگا کے آسنوں کی مشق کر لی۔ گھنٹہ بھر اسی طرح گزار کر میں اپنی کوٹھری کے تالہ کھلنے کا انتظار کرتا۔ تالہ کھلتا تو کیتلی اٹھا کر میں سیدھا چولھے کے پاس پہنچتا۔ چائے پکاتا، پھر خود ہی اسے اٹھا کر اندر لاتا اور پیالی سامنے رکھ کر آدھ گھنٹہ تک آہستہ آہستہ چائے پیتا۔ اس سے فارغ ہو کر ایک سگریٹ سلگاتا اور احاطہ ہی میں چہل قدمی شروع کر دیتا۔ اس وقت تک دیوار کے سرے پر سے سورج نظر آنے لگتا تھا۔ چہل قدمی سے فارغ ہو کر میں چٹائی بچھا کر کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ دس بجے تک کھانا آجاتا کھانا کھا کر پچھلے روز کا اخبار پڑھتا۔ اخبار دس بجے کے قریب ملتا تھا اور ایک روز پرانا ہوتا تھا مگر میں اس پر ٹوٹ پڑتا اور دو گھنٹہ میں اُردو اور انگریزی اخبار کا ایک ایک لفظ پڑھ ڈالتا۔

دوپہر عام طور پر بڑی مشکل سے کٹتی تھی، دوپہریں اتنی سنسان اور غمگین اور خوفناک تھیں کہ میں اپنے آپ ہی سے ڈرتا رہتا۔ ان دوپہروں کی خاموشی اور ان کا وہ بے روح سناٹا کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ عجیب سنسان سے دن تھے، ہوا

دن بھر چلتی رہتی اور پیپل کے پتے ٹپ ٹپ میرے احاطہ کے صحن میں گرتے رہتے ان پتوں کے گرنے سے اور ہوا کی سائیں سائیں سے فضا اور بھی غمگین، اور بھی اُداس معلوم ہوتی تھی۔

میں دس بجے سے دو بجے تک کوئی ایک ہزار بار اُٹھ کر سایوں کو دیکھتا۔ دوپہر کے ڈھلنے اور پھر سائے کے اس نشان تک پہنچنے کا انتظار کرتا جو میں نے چائے کے وقت کے لئے دیوار پر لگا رکھا تھا۔ ہر دوپہر مجھے صدیوں لمبی نظر آتی تھی مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح ہر دوپہر گزر جاتی اور میں چائے پکاتا۔ چائے پیتا اور ڈاکٹر صاحب کی آمد کا انتظار کرتا۔ ڈاکٹر صاحب تین بجے کے قریب آتے تھے، وہ باہر سے دروازہ تھپتھپاتے اور ایک مشقتی دروازے کے پٹ کو ذرا سا کھول کر ٹین کی وہ ڈبیا جس میں اٹھارہ نمبر کی خوراک ہوتی تھی آگے بڑھا دیتا۔ میں دوائی پی لیتا۔ ڈاکٹر صاحب کی اٹھارہ نمبر میں کوئی اثر نہیں تھا کیونکہ ایک روایت کے مطابق (جو بالکل صحیح معلوم ہوتی تھی) ڈاکٹر صاحب نے پندرہ نمبر، اٹھارہ نمبر، بیس نمبر اور پچیس نمبر کے لیبل بالترتیب ان بوتلوں پر لگائے ہوئے تھے جن میں پندرہ، اٹھارہ، بیس اور پچیس روز پرانا پانی رکھا ہوا تھا۔ لیبل صرف اس لئے لگائے گئے تھے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ پانی کتنے دن پرانا ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے باوجود میں سارا سال روزانہ یہ خوراک پیتا رہا، صرف اس لئے تاکہ ایک منٹ ہی کے لئے مجھے کوئی مخاطب تو کرے، مجھ سے کوئی بات تو کرے۔

چار بجے کھانا آتا اور پانچ بجے مجھے کوٹھری میں بند کرکے اس پر تالہ ڈال دیا جاتا۔ پھر احاطہ کا تالہ پڑ جاتا۔ پھر دم تنہائی کا بڑا پھاٹک بھی مقفل ہو جاتا اور لمبی خوفناک رات شروع ہو جاتی۔

یہ راتیں بڑی سنسان تھیں۔ کمرے کے سلاخدار دروازہ اور کھڑکیوں میں سے باہر احاطہ کی جو دیواریں نظر آتی تھیں وہ اسقدر بلند تھیں کہ ان کے اوپر چاروں طرف سے آسمان ایک پتلی لکیر کی صورت میں نظر آتا۔ چاروں طرف سے دیواروں کے سروں پر آسمان کی صرف دو فٹ چوڑی لکیر نظر آتی جس میں اندھیری راتوں کو ستاروں کی شمعیں روشن نظر آتیں، کیسے خوبصورت ننھے ننھے ستارے رات بھر ٹمٹماتے رہتے اس وقت میرے دل میں ایک ہی حسرت ہوتی، کاش میں پورے آسمان کو آسمان کے پورے ستاروں کو دیکھ سکوں۔ میں اس آسمان کو بھول چکا تھا جس کی نیلی چادر میں ہزاروں، لاکھوں روشن ستارے رات بھر جگمگاتے رہتے ہیں۔ میں ہر رات یہ عہد کرتا کہ اب رہا ہونے کے بعد میں فطرت کے اس حُسن کو اپنے دل اور اپنی نگاہوں کے قریب رکھوں گا جس سے مجھے ظالمانہ طریقہ سے الگ کیا گیا ہے۔ زندگی میں کتنی ہی بار ان ستاروں کو دیکھا تھا مگر ایسا حُسن، ایسا جوش اور ایسی مسرت کبھی نظر نہ آئی تھی۔ یا محسوس نہیں کی تھی جو اس وقت محسوس ہوتی تھی۔ چاندنی راتوں میں تنہائی کی بے کلی اور بھی بڑھ جاتی۔ چاندنی میری کوٹھری سے باہر دودھ کی طرح پھیلی رہتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ چاندنی ان بھوری میلی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر

رو رہی ہے۔ اس چاندنی کا حسن ایسا لازوال اور اسقدر زبردست ہوتا تھا کہ میں گھنٹوں اپنے دروازے کی سلاخوں کو پکڑے بیٹھا رہتا اور اس چاندنی کو دیکھتا رہتا۔ یہ چاندنی اپنے ساتھ کتنی یادیں، کتنے غم اور کسقدر اسرار لئے ہوئے آتی تھی۔ میں اپنے دروازے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس دودھیا چاندنی کو جیسے پیتا رہتا تھا۔

اکتوبر کے آخر تک راتیں بھی لمبی ہونے لگی تھیں اور کسی طرح گزرنے ہی میں نہ آتی تھیں۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں روزانہ پروانے آتے اور اس پر نثار ہو جاتے۔ روزانہ میں اپنی محبوب چھپکلی کا انتظار کرتا جو آکر مجھے ان سے نجات دلاتی تھی۔ کسی روز چھپکلی نہ آتی تو میری بے کلی بڑھ جاتی اور میں اس مکروہ صورت کو تنہائی میں بیٹھا پکارتا رہتا۔ بس یہی میرے ساتھی تھے۔

صلیب

میرے احاطہ کی شمالی دیوار کے باہر بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ پہلی راتوں میں چاند اس کھمبے کے پیچھے سے نمودار ہوتا۔ کھمبا اس قسم کا تھا کہ اس کا سایہ میری کوٹھری کی دیوار پر ایک صلیب کی شکل میں پڑتا، پھر چاند اپنے سفر پر روانہ ہوتا تو یہ صلیب بھی میرے سرہانے کی دیوار پر سفر شروع کر دیتی۔ چاند کی حرکت بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ صلیب کبھی ایک دیوار سے یہ سفر شروع کرتی، کبھی کسی دوسری دیوار سے، اس طرح یہ سفر رات بھر جاری

رہتا۔ میں اس صلیب کو دیکھتا رہتا اور ہر رات مصلوب ہوتا تھا۔ ہر رات مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں پھانسی کے تختے پر لٹک رہا ہوں۔ میں پہروں یہ سوچتا کہ وہ لوگ کتنے خوش نصیب تھے جو ایک ہی بار مصلوب ہو کر نجات پا گئے۔ آج کے انسان کو تو ہر رات نئے طریقہ سے مصلوب ہونا پڑتا ہے، ہر رات کی ذہنی اذیت اور ذہنی موت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ وقت کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے۔ لیکن جو زمانہ گزر گیا تھا اس کی اذیت تو بھول گئی تھی مگر جو زمانہ پہاڑ کی طرح سر پہ کھڑا تھا، اس کے بارے میں میں سخت اذیت میں مبتلا رہا۔ اکتوبر کے آخر میں اخباروں کی بعض خبروں سے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ بعض نظر بند چھ ماہ کے بعد رہا کر دیے جائیں گے۔ میری چھ ماہ کی نظر بندی ۹ر نومبر کو ختم ہونے والی تھی۔ کل بیس بائیس دن باقی رہ گئے تھے۔ ان دنوں میں وہ سارا سکون ختم ہو گیا جو اس زندگی کا عادی ہو جانے کی وجہ سے مجھے حاصل ہونے لگا تھا۔ دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ شاید میں رہا ہو جاؤں، شاید میں بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جو نومبر کے شروع میں رہا ہو جائیں گے۔

امید کی اس شمع نے ایک بار پھر بے چین کر دیا۔ یوگا کے آسن اور گیان دھیان کے اوقات میں بھی یہ خیال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا کہ نہ معلوم کیا ہو جائے۔ سیفٹی ایکٹ یوں تو سدا بہار ہے۔ اس کی کوئی مدت ہی نہیں۔ حکومت چاہے تو ایک نظر بند کو

تاعمر قید رکھ سکتی ہے اور رکھا ہوا بھی ہے لیکن میں اپنے متعلق سوچتا تھا کہ میں کوئی اہم آدمی نہیں ہوں۔ میں نے ابھی تک کوئی کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیا۔ اپنی پرانی زندگی پہ نظر ڈالتا تو مجھے اپنا کوئی جرم بھی ایسا نظر نہ آتا جس پر میں ایک روز کی سزا کا بھی مستحق ہو سکتا۔ پھر مجھ پہ یہ کرم فرمائی کیوں ہو رہی ہے؟ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ صرف پروگرام بنائے تھے، صرف خیال ہی خیال میں عہد کیا تھا کہ اس زندگی کو، اس جانِ حزیں کو وطن کی بے بسی پر قربان کرنا ہے۔ میں اکثر سوچتا' کاش! میں نے کوئی ایک کارنامہ ہی سرانجام دیا ہوتا' کوئی ایک کام تو کیا ہوتا۔ ابھی تو بغیر کسی وجہ کے محض دوسروں کے ساتھ پکڑ لیا گیا ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میرے دل میں یہ اندیشہ نہایت پختہ تھا کہ میں رہا نہیں کیا جاؤں گا۔ میرے متعلق پولیس کچھ بہت زیادہ سختی کی طرف مائل نظر آتی تھی۔ بہتر کلاس عام طور پر پولیس کی سفارش سے ملتی ہے۔ ہماری عرضیوں پہ ندیم صاحب اور حسن عابدی کو بی کلاس مل گئی تھی مگر مجھے ابھی تک اس سے محروم رکھا گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس نے مجھے بہتر کلاس دینے کی مخالفت کی ہے۔ اور پولیس اس کی مخالفت کرتی ہے تو میں نے ضرور کوئی بڑا جرم کیا ہوگا۔

نومبر کے شروع میں مجھے ایک جیل آفیسر نے یہ بھی بتا دیا کہ جس نظربند کی میعاد نظربندی میں توسیع کرنی ہوتی ہے حکومت اس کو اس توسیع کی خبر پہلی نظربندی کی مدت ختم ہونے سے پندرہ بیس روز پہلے ہی دے دیتی ہے۔ یعنی اگلے چھ مہینے کی

نظر بندی کے وارنٹ پر پندرہ بیس روز پہلے تعمیل کرا لی جاتی ہے اور یہ بھی کہ یہ قانونی طور پر ضروری ہے۔

نومبر ۱۹۵۱ء کی تین چار تاریخ کے اخباروں میں خبر آ گئی کہ احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری کو رہا کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر اور حکومت کی طرف سے نئے وارنٹ نہ آنے کی وجہ سے مجھے واقعی یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ میں رہا کر دیا جاؤں گا، تاہم دل میں جو یہ شبہ تھا کہ مجھ پر حکومت کی نظرِ کرم کچھ زیادہ ہے وہ بھی باقی رہا اور میں یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ اگر رہا کرنا ہوتا تو مجھے بھی ندیم اور ظہیر کے ساتھ رہا کر دیا جاتا۔

دو تین نومبر سے لے کر آٹھ نومبر تک کا جو ہفتہ تھا وہ تو جیسے میرے احاطہ میں آ کر جم گیا تھا۔ مجھے اکثر یوں معلوم ہوتا گویا وقت نے چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ ہر بار احاطہ کا دروازہ کھلتا تو میں امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا۔ ہر افسر کے آنے پر مجھے یہ اندیشہ بھی ہوتا کہ چھ مہینے کی مزید نظر بندی کا وارنٹ لے کر آیا ہے اور یہ خیال بھی ہوتا کہ شاید رہائی کے احکامات آ گئے ہوں۔

۹ نومبر

آخر ۹ نومبر کا وہ تاریخی دن آ پہنچا۔ صبح سویرے میری آنکھ کھلی۔ اس روز یوگا کے آسن اور سمادھی لگانے کو بھی دل نہ چاہا۔ ویسے میں مایوس سا تھا۔ خیال یہ تھا کہ چونکہ

رہا کئے جانے والوں کو مقررہ دن سے ہفتہ دس دن پہلے ہی رہا کر دیا جاتا ہے، اور ندیم اور ظہیر کی رہائی بھی ہو چکی ہے اس لئے میں رہا نہیں ہوں گا مگر نئے احکامات نہ آنے کی وجہ سے کچھ پریشانی بھی تھی۔

کوئی ساڑھے چھ بجے ڈپٹی صاحب آئے تو میں نے ان سے کہا "خدا کیلئے بتایئے کہ مجھے جانا ہے یا یہیں پر رہنا ہے۔ اگر مجھے توسیع کی اطلاع مل جائے تو میں اس کشمکش سے تو نجات پا جاؤں"

"تم بستر وغیرہ باندھ کر تیار رہو" انہوں نے کہا "اگر تمہیں رکھنا ہوتا تو اب تک تمہارے احکامات آ گئے ہوتے۔ خیال ہے کہ تم رہا ہو جاؤ گے"

ان کے جانے کے بعد میں نے بستر باندھا۔ سوٹ کیس میں کپڑے اور کتابیں جمائیں اور رہا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی آٹھ بجے احاطہ کا دروازہ کھلا۔ ڈپٹی صاحب دروازہ میں نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اور ایک نمبردار ان کے ساتھ ساتھ قلم دوات اٹھائے ہوئے چلا آ رہا تھا۔

انہیں اس شان سے آتے دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ رہائی کی بجائے آج توسیع نظربندی کے احکامات آ گئے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنا بستر فوراً کھول دیا اور ڈپٹی صاحب سے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔

انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کچھ تسلی آمیز فقرے بولنا شروع کئے۔ غالباً ان کو یہ ہدایات ہوتی ہیں کہ ایسے احکامات اس طرح مت سُناؤ کہ نظر بند کو صدمہ پہنچ جائے اور اس کا ہارٹ فیل ہو جائے۔ مگر میں تو اپنی حکومت کے بارے میں پہلے سے ہی کچھ زیادہ پُر امید نہ تھا اس لئے مجھے زیادہ صدمہ نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے ان کی بات کاٹ لی اور دست بستہ عرض کی کہ "حضور! میں زیادہ دیر کشمکش و پیچ میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ آپ جو بُری خبر بھی لائے ہیں سُنا دیجئے، میں بالکل تیار ہوں"

انہوں نے ٹائپ شدہ دس سطری مسودہ میرے سامنے کر دیا۔ وہی منحوس عبارت درج تھی "گورنر پنجاب کو اطمینان ہے کہ.......... حمید اختر کی نظر بندی مزید چھ مہینے کے لئے امنِ عامہ کی حفاظت کے پیشِ نظر اشد ضروری ہے اس لئے اسے ۹ رمئی ۵۲ء تک نظر بند رکھا جائے گا"

میں نے اس پر دستخط کر دئے۔ اس وقت مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب مجھ سے زیادہ پریشان ہیں۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میں نے کہا "شیخ صاحب! اجازت ہو تو ایک لطیفہ سُناؤں؟"

"سُناؤ!" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

میں نے کہنا شروع کیا کہ "ایک دل کا مریض تھا جس کا علاج دل کے امراض کا ایک ماہر ڈاکٹر کر رہا تھا۔ مریض کے نام ایک لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئی مگر چونکہ اس کا دل کمزور تھا اس لئے اس کے وارثوں کو یہ پریشانی لاحق ہوئی

کہ خوشی کی اتنی بڑی خبر سُن کر کہیں اس کا دل فیل نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے معالج ڈاکٹر کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ اپنے مریض کو یہ خبر کسی نہ کسی طرح سُنا دے۔

اب اس شام ڈاکٹر صاحب نے مریض کے پاس آ کر اس سے کہا "اگر تمہارے نام بیس ہزار روپے کی لاٹری نکل آئے تو کیا کرو گے؟"

مریض نے کہا "بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ ایک اچھا سا مکان بنوا کر اس میں رہوں گا اور ایک ہزار روپیہ خیرات کر دونگا"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "اور اگر تمہیں پچاس ہزار روپے کی لاٹری مل جائے؟"

مریض نے کہا "ڈاکٹر صاحب جانے دیجئے، ہماری ایسی قسمت کہاں ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے بڑے زور سے کہا "بہرحال تم بتاؤ تو سہی"

مریض نے پریشان ہو کر جواب دیا "جناب ایک کار خرید لوں گا، ایک کوٹھی بنوا لوں گا اور اپنے غریب رشتہ داروں کی ہر ممکن مدد کروں گا"

"اور اگر تمہیں ایک لاکھ روپیہ مل جائے؟" ڈاکٹر صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

مریض نے جھنجھلا کر کہا "ڈاکٹر صاحب! اگر مجھے ایک لاکھ روپیہ مل جائے تو خدا کی قسم! اس میں سے پچاس ہزار روپیہ آپ کو دے دوں گا"

مریض کی یہ بات سُن کر ڈاکٹر صاحب کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

ڈپٹی صاحب یہ لطیفہ سُن کر ہنسے تو میں نے کہا "آپ کی حالت دیکھ کر مجھے اس ڈاکٹر کا خیال آتا ہے جس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ آپ بے فکر رہیے میں ایسی مصیبتوں کا عادی ہوں"

ڈپٹی صاحب میری ڈھٹائی پر حیران ہو کر ہنستے ہوئے احاطہ سے باہر نکل گئے۔

پھر وہی سلسلۂ روز و شب

یہ تو بُرے آثار ہیں فانی، غم ہو، خوشی ہو، کچھ تو ہو!
دل کا یہ کیا حال ہوا، مغموم نہیں، مسرور نہیں

نظر بندی کے نئے دن شروع ہو گئے۔ مگر یہ اس قسم کے دن نہ تھے جیسے پہلی شش ماہی کی نظر بندی کے شروع میں تھے۔ اس وقت میں اگرچہ اس دام میں نیا تھا مگر اس وقت کتنے رفیق، کتنے دوست ساتھ تھے۔ اب کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک بے رحم لامتناہی تنہائی تھی، یہ احاطہ تھا اور آسمان کی ٹکڑی تھی جو ٹوپی کی شکل میں میرے سامنے تھے۔ میں بہت دنوں تک اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچتا رہا جو میری طرح ابھی اندر تھے، داد امنصور، غلام محمد احمد فضل حسن عابدی، شمیم اشرف سبھی لوگ ابھی اندر تھے۔ ندیم صاحب اور ظہیر کاشمیری

رہا ہو گئے تھے مگر وہ باہر کیا کر رہے ہوں گے ۔ ان کی باتیں کیسی ہوں گی ۔ وہ کس سے ملتے ہوں گے ۔ خاص طور پر ندیم صاحب اس دنیا کو کیسے دیکھتے ہونگے جس میں ہم اور وہ اکٹھے گھومتے تھے، ایک ساتھ پھرتے تھے ۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا ۔ میں اس دنیا کو بھول گیا جو اس احاطہ سے باہر تھی ۔ اس کی صورت میرے ذہن سے بھی نکل گئی ۔ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں میں یہ ضرور سوچتا کہ وہ پھولوں، باغوں، گلزاروں اور آبشاروں کی دنیا کیسی ہے؟ وہاں اب بھی پھول کھلتے ہوں گے اور زرق برق لباس میں لوگ سڑکوں پر ٹہلتے ہونگے اپنے دُکھوں، اپنے غموں اور اپنی خوشیوں کا ذکر کرتے ہوں گے مگر میں کہاں ہوں، جہاں کوئی آواز نہیں ہے، جہاں امید کی روشنی کی کوئی شعاع نظر نہیں آتی ہر طرف سکوت مرگ ہے، ہر طرف بھوری دیواریں ہیں اور تالے اور کٹھرے ہیں، زنجیریں ہیں ۔

میں یہ بھول گیا کہ سرِ شام مغرب میں شفق کے رنگ کیسے دلآویز ہوتے ہیں، کیونکہ چھ ماہ سے میں نے وہ لکیر بھی نہیں دیکھی تھی جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں، کچھ بھی نظر کے سامنے نہ تھا ۔ صرف بھوری اور بے مہر دیواریں تھیں اور سنگدل زمین تھی ۔

نومبر کی ایسی ہی ایک رات میں میرے احاطہ کے باہر پھانسی والوں کی پہلی کوٹھری سے حیات محمد نے مجھے پکارا ۔

"شاہ جی! کیا حال ہے؟"

"حیات محمد! شکر ہے خدا کا، گذر رہی ہے"

"شاہ جی! تم تو پچھلے ہفتے رہا ہونے والے تھے" اس نے کہا۔

"میری قید بڑھ گئی ہے"

"قید بڑھ گئی ہے؟ کوئی اور مقدمہ نکل آیا ہے؟" اس نے پوچھا

میں نے حیات محمد کو بڑی مشکل سے سمجھایا کہ میرا مقدمہ تو ایک بھی نہیں ہے مجھے تو احتیاطاً قید کیا ہوا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا "شاہ جی! آپ سردار ہیں، سید ہیں، خدا آپ کی دعا ضرور قبول کرے گا۔ میرے لئے دعا کرنا، میں نے رحم کی اپیل کی ہوئی ہے"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میری دعا میں اثر ہوتا تو میں خود آج یہاں کیوں پڑا رہتا۔ لیکن موت کے اس مسافر کا دل توڑنے کی ہمت اپنے میں نہ پاتے ہوئے میں نے اس سے کہا "ضرور دعا کروں گا حیات محمد! خدا نے چاہا تو تم رہا ہو جاؤ گے ——— مگر پہلے تم مجھے ماہیا سناؤ"

رات کے سناٹے میں اس نے گانا شروع کیا۔

اساں تیتھوں کی لیناں

فکر نہ کریں چن وے، سدا کٹھیاں نئیں رہناں

اس کی آواز سوز سے بھری ہوئی تھی، وہ اپنی رُوح کے سارے غنا اور ساری مستی کو بروئے کار لاتے ہوئے گا رہا تھا۔ اس کی آواز سُن کر اس سے اگلی کوٹھڑی میں سے غلام عیسٰے نے بھی گانا شروع کیا۔

گڈی آئی کائی والی اے

اوتے ٹکٹ ناں ڈیویں بابو

ساڈی رات جُدائی والی اے

یہ سُن کر مرید خاں اپنی پاٹ دار گونجیلی آواز میں کوئی بلوچی نغمہ گانے لگا۔ وہ بار بار "ڈاچی والیا موڑ مہار وے" کی رٹ لگا رہا تھا۔

غلام عیسٰے نے کہا "مرید خاں! تجھے گانا نہیں آتا"

مرید خاں نے کہا "گانا نہیں آتا، تو نے اگر مجھے اپنی ڈاچی پر چڑھ کر گاتے ہوئے سُنا ہوتا تو یہ بات کبھی نہ کہتا۔ اب تو جیل کی تیل والی دال کھانے اور ڈیڑھ سال تک کوٹھی میں بند رہنے کی وجہ سے میں گانا بھولتا جا رہا ہوں مگر باہر کی دنیا میں میرا گانا سُن کر سوانیاں (عورتیں) کام کاج چھوڑ کر میرے گرد ہو جاتی تھیں"

"اچھا مرید خاں اللہ رحم کرے گا" غلام عیسٰے نے کہا۔

"آمین! آمین!!" مرید خاں نے جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ پھانسی والے اپنے اپنے اندیشوں میں غرق ہو گئے اور اپنی اس دنیا کے بارے میں سوچنے لگے جسے وہ باہر چھوڑ آئے تھے۔ جس سے

ان کے سارے تعلق ٹوٹ گئے تھے۔ میں بھی خاموش ہو گیا اور اپنے فکروں میں غلطاں چپ چاپ لیٹا ہوا کتاب پڑھنے لگا۔

باہر ہوا چیختی ہوئی چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ عجیب دہشت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی گویا یہ رات نہیں بلکہ موت ہے جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی حیات محمد کے کروٹ بدلنے کی آواز آتی، پھر وہ گنگناتا۔

"سدا اکٹھیاں نئیں رہناں"

اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

اس زمانے میں میرا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ احساس جیسے بالکل فنا ہو گیا تھا۔ رنج، غم، خوشی یا جذبہ کچھ بھی دل میں موجود نہ تھا۔ بس ایک سناٹا، ایک بے حسی تھی جو سارے وجود پر طاری رہتی۔ میں صرف یہ سوچ کر پریشان رہتا تھا کہ میری نظر بندی کی توسیع کی خبر کو میری بیمار بہن اور میری بڑی بہن نے کس طرح سُنا ہوگا اور ان دونوں بہنوں کو اس سے کسقدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس توسیع نظر بندی کے بعد میں نے جو خط گھر لکھا تھا اس کا جواب مجھے میری بھتیجی عذرا نے دیا تھا۔ اپنے گھر میں عذرا مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ بہن سخت بیمار ہے اور میری نظر بندی کی مدت بڑھنے سے اُسے سخت صدمہ ہوا ہے۔ آخر میں عذرا نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے سکول میں خانہ داری کی کلاس میں بہت سے

کھانے پکانے سیکھ لئے ہیں اور اب وہ میرا انتظار کر رہی ہے تاکہ میں آؤں تو وہ مجھے یہ تمام کھانے پکا کر کھلائے۔

آخر میں عذرا نے لکھا تھا "چچا جان! میں آپ کی تصویر کو روزانہ صاف کرتی ہوں اور اسے صاف کرتے وقت مجھے رونا آجاتا ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرتی ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ جلد میرے پاس آجائیں اور میں پھر آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی باتیں سُنا کروں۔

آپ کی تابعدار بیٹی

عذرا خانم"

عذرا کا یہ خط پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے میری نظر کے سامنے اپنا سونا گھر پھر گیا۔ پھر میں نے سوچا "نہ معلوم ایسے کتنے اور گھر ہوں گے جہاں کتنی ہی ننھی معصوم رُوحیں عذرا کی طرح روتی ہوں گی، مگر وہ جو قلم کی ایک جنبش سے یہ لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "ہمیں اطمینان ہے کہ اس شخص کو ابھی اور چھ ماہ تک جیل میں رکھنا ضروری ہے" وہ اس حقیقت کو بھلا کیسے سمجھ سکتے ہیں؟

ان دنوں اپنی بے حسی اور بے دلی کی رعایت سے مجھے فانیؔ کا یہ شعر اکثر یاد آتا تھا اور میں اکثر گنگناتا رہتا کہ:-

یہ تو بُرے آثار ہیں فانیؔ، غم ہو، خوشی ہو، کچھ تو ہو

دل کا یہ کیسا حال ہوا، مغموم نہیں، مسرور نہیں

یہ شعر میں نے اپنے واحد ساتھی یعنی اخبار پہنچانے والے ماسٹر صاحب کو بھی سُنایا۔ انھوں نے فوراً یہ شعر نوٹ کر لیا اور وہیں بیٹھ کر منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اسے یاد کرنے لگے۔ اس دن کے بعد ان کا یہ معمول تھا کہ صبح کے وقت اخبار لے کر جونہی وہ احاطہ میں داخل ہوتے تو زور سے پکارتے ؎

یہ تو بُرے آثار ہیں فانؔی ....

یہ شعر انھوں نے اتنی بار اور اس طرح پڑھا کہ مجھے یہ شک ہونے لگا کہ یا تو وہ مجھے فانؔی سمجھ رہے ہیں یا اپنے آپ کو۔ انہیں غالباً یہی ایک شعر یاد تھا۔ خیر یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر بات یہاں تک بڑھی کہ میں ان سے کسی روز اگر یہ کہتا "ماسٹر صاحب! آج تو موسم بدلا ہوا نظر آتا ہے"

وہ فوراً جواب دیتے "جی ہاں! یہ تو بُرے آثار ہیں فانؔی....."

میں کہتا "مصر میں حالات بہت خراب ہو گئے ہیں؟"

وہ فوراً جواب دیتے "یہ تو بُرے آثار ہیں فانؔی......"

میں کہتا "آجکل اخبار میں کوئی خبر ہی نہیں ہوتی" تب بھی وہ جھٹ سے بول اُٹھتے "یہ تو بُرے آثار ہیں فانؔی........"

انھوں نے اس شعر کو اس قدر رگیدا کہ بالآخر مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ اگر میں بات بدلنے کے لئے ان سے کہتا کہ فانؔی کا یہ شعر مجھے اس کے سارے دیوان پر بھاری نظر آتا ہے تو وہ جواب دیتے "اچھا؟" اور ازحد تعجب سے منہ

کھول لیتے کہ میں پریشان ہو جاتا۔ اس کے باوجود میں ان کا انتظار کرتا اور پہروں یہ سوچتا کہ وہ اخبار دینے آئیں گے تو ان سے دو منٹ بات کر کے اپنی تنہائی میں ذرا کمی کر لوں گا۔

اپنی دنیا میں

جب باہر کے سارے دروازے بند ہو گئے، جب امیدوں کی تمام شمعیں جھلملا کر بجھ گئیں اور جب مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ میں اپنی پیدائش سے لے کر اس وقت تک اسی گھرے کنوئیں میں ہوں، انہی دیواروں کی قید میں اور ان اونچی بیرحم دیواروں کے باہر کچھ بھی نہیں ہے تب میں نے اپنے اندر ایک نگاہ ڈالی۔ اس وقت میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے ہی دل کی گہرائیوں میں اترنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ باہر کے دروازے بند ہونے کے بعد جب اندر کے دروازے کھلے تو مجھے اپنی زندگی کی ساری داستان یاد آ گئی۔ اس دل میں، اس مدفن میں کتنی یادیں دفن تھیں۔ بچپن کی زندگی سے لے کر اس وقت تک کی زندگی کے تمام واقعات و حادثات قطار در قطار میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میرے آبائی وطن تہاڑہ ضلع لدھیانہ میں گزرا ہوا میرا بچپن، لدھیانہ میں گزرے ہوئے نوجوانی کے دن، بمبئی میں گزرے ہوئے جوانی کے لمحات اور ان کی یادیں، یادوں کا ایک پورا قافلہ تھا، کتنے ہی دوستوں کی شکلیں نظروں کے سامنے پھر گئیں جن کو میں فراموش کر چکا تھا۔

جو زندگی کے بہتے ہوئے سمندر میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے تنہائی کی ان راتوں میں ان سب یادوں کو آباد کیا۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حادثہ کو اپنے دل کی تہوں سے نکالا اور ان کی گرد جھاڑ کر ان کا ایک گلزار اپنے سامنے آراستہ کر لیا۔

نومبر دسمبر کی ان سرد زمستانی راتوں میں، جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھیں، میں اپنی کال کوٹھری میں لیٹا حسین خواب دیکھتا رہتا۔ اس وقت کتنے محبوب نظر کے سامنے ہوتے، کتنے ہی جسم، کتنی ہی آنکھیں اپنی جانب نگراں دکھائی دیتیں اور محبوبوں کے کھلتے ہوئے ہونٹ اور لہراتی ہوئی زلفیں یاد آتیں۔ میں تصور ہی میں ان زلفوں سے لپٹ کر کتنی بار رویا ہوں۔ اپنے ذہن میں میں نے ہزاروں بار بھینچے ہوئے شگفتہ لبوں کا نقشہ بنایا اور بھولی ہوئی یادوں کے مزاروں سے کتنے ہی حسین جسموں کو کھینچ لایا۔ زندگی میں کہیں بھی، کسی راستے پر، میری زندگی کے کسی ایک لمحے میں بھی جہاں کہیں کسی حسین، کسی خوبصورت شے کا داخلہ ہوا تھا میں نے اسے ڈھونڈھ کر نکال لیا اور اس سے اپنا اجڑا ہوا دیار روشن کیا۔

کال کوٹھری کے اس بے رحم فرش پر لیٹے لیٹے میں نے اپنی زندگی کے سارے واقعات کو یاد کیا۔ اپنی فطرت، اپنی عادتوں اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لیا۔ اس فرش پر لیٹ کر میں نے ان سنگدل محبوبوں کو پکارا جو مجھے فراموش کر چکے تھے اور پھر ان شیریں دہنوں اور ان مہربان حسینوں کو یاد کیا جنھوں نے میری زندگی کو دوام بخشا تھا۔ جن کی باتیں، جن کے زلف و رخسار، جن کی تصویریں، جن کے تمام نقش میرے ذہن میں

محفوظ تھے، جن کے لطف و کرم نے مجھے رُوح کا ارتقا بخشا تھا۔

ان یادوں سے میں اس اندھیرے میں اُجالا بھرنے کی کوشش کرتا رہا کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ زمین اور آسمان کی ازلی، ابدی حقیقتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پھول نہیں تھے، بچے نہیں تھے، چشمے اور زندگی اور زندگی کا حُسن اور اس کا بانکپن سب کچھ فنا ہو گیا تھا، مٹ گیا تھا۔ اور اس بے بسی اور محرومی نے میرے احساس کو جلا دیدی تھی۔ احساس کی شدّت بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے میری ہر یاد، یاد کا ہر ایک پہلو مجھے کئی طرح سے ڈستا تھا۔ میں نے ہر وار کو برداشت کیا۔ اس کی تکلیف کو بھول کر اس میں سے لذّت حاصل کی۔ ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان اپنے دکھوں، اپنے غموں اور اپنے زخموں سے لذّت حاصل کرتا ہے۔ میرے لئے یہ مقام آ گیا تھا اور میں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اس کے دامن میں بیٹھ کر میں نے تنہائی کے یہ خوفناک لمحے گذار دیئے۔

دسمبر میں سردی بڑھ گئی تھی، راتیں لمبی ہو گئی تھیں۔ اگر اس وقت میں ان یادوں سے اپنی سونی اور ویران دنیا کو آباد نہ کر لیتا تو یقین ہے کہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

اس زمانے میں باہر سرد ہوا چیختی ہوئی چلتی رہتی۔ باہر احاطہ میں پھیلی ہوئی چُپ چاپ خاموش لیٹی ہوئی چاندنی کو ایک نظر دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا گیا اس حُسن کو قابو میں کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔ چاندنی کے اس حُسن کو دیکھ کر ذہن

جو کچھ محسوس کرتا اسے بیان کرنا اس قدر مشکل ہے کہ میں پہروں یہ سوچا رہتا کہ ان محسوسات کو نوکِ قلم پر لانے کے لئے ابھی انسان کو صدیوں کی مدت درکار ہے۔ اس گہری پُر اسرار خاموشی اور گھمبیر چاندنی میں میں رات رات بھر جنگلے کے ساتھ لگا بیٹھا رہتا اور راتوں کی خاموش گفتگو سنتا رہتا۔ دم بدم بڑھتی پھیلتی ہوئی سرد زمستانی ہوا کتنے ہی بے نام پیغام دے جاتی اور میری رُوح کتنے ہی اندیشوں اور دکھوں سے لرزتی رہتی۔

پھر اندھیری راتیں آ جاتیں۔ دروازہ کی سلاخوں میں سے باہر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا گویا سیاہی کی ایک چادر لپٹی ہوئی ہے اور موت اپنے پر پھیلائے پوری دنیا پر مسلّط ہے۔ لیکن اس سیاہی میں ستاروں کی شمعیں زیادہ روشن ہو جاتی تھیں اور میں دیر تک کھڑکی کی سلاخوں میں سے دیواروں کے اوپر آسمان کی پتلی لکیر میں ان ستاروں کو دیکھتا اور اپنی زندگی کے بارے میں غور کرتا رہتا۔

نئے ساتھی

انسانوں کی طرف سے مایوس ہو کر اور یہ سوچ کر کہ ابھی نہ معلوم اور کتنا عرصہ مجھے یہ آسمانی ٹوپی سر پہ پہنے اسی گہرے کنوئیں میں رہنا ہے، میں نے اپنی کوٹھری میں اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کچھ نئے ساتھی ڈھونڈھ نکالے اور انہی سے مل کر وقت گزارنے لگا۔ معمولی سا جائزہ لینے کے بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس کوٹھری میں میرے علاوہ

ایک اور جاندار بھی ہے۔ یہ جاندار ایک بیا تھا جس نے بجلی کی اس تار کے آخری سرے پر اس ہولڈر کے نیچے اپنا آشیانہ بنا رکھا تھا جس میں بجلی کا کنکشن اور بلب موجود نہیں تھا۔ یہ بیا سیاہ رنگ کا چھوٹا سا پرندہ تھا اور اس کی کھال اور اس کے سیاہ پر بے حد چمکدار تھے۔ مگر خود یہ اسقدر دل برداشتہ اور گوشہ نشین واقع ہوا تھا کہ مجھے کئی کئی دن اس کی صورت نظر نہ آتی۔ اس کا گھونسلہ بھی بڑی خستہ حالت میں تھا۔ مگر وہ اسے بنانے اور ٹھیک کرنے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی تازہ غم پہنچا ہے جس کی وجہ سے وہ بے ثباتی دنیا کا شاکی نظر آتا ہے۔ باوجود سخت جاڑے کے اس نے نہ تو اپنا گھونسلہ ٹھیک کیا اور نہ ہی اپنا گھر بسانے کی طرف کوئی توجہ دی تھی۔ بس وہ اپنی موجودہ حالت میں مست اور مطمئن نظر آتا تھا۔ سرِ شام وہ کوٹھری میں داخل ہو کر گھونسلہ کے پاس بیٹھ جاتا اور نوحہ و نالہ و فریاد کناں نظر آتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے اس ٹوٹے پھوٹے ویرانے میں داخل ہو جاتا۔

میں نے اس سے دوستی کرنے کی کوشش سب سے پہلے کی کیونکہ اس کے اور میرے حالات میں کافی مماثلت پائی جاتی تھی، مگر اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ان معاملات سے بالاتر ہو چکا ہے۔

اس طرف سے مایوس ہو کر میں ان کبوتروں کی طرف متوجہ ہوا جو اکثر میری کوٹھری میں آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ صبح کے وقت ناشتہ کے لئے مجھے جو چنے ملتے تھے وہ

میں نے ان کو ڈالنا شروع کر دئے۔ شروع شروع میں تو انہوں نے بھی پروا نہیں کی بلکہ پہلے روز جب میں نے ان کی بے نیازی سے تنگ آ کر ہاتھ کے اشارے سے انہیں نیچے اترنے کے لئے کہا تو ایک بزرگ کبوتر نے آنکھیں کھول کر پھر اسی طرح بند کر لیں گویا کہہ رہا ہو "بڑے مطلبی ہو یار!" مگر خیر دو ایک روز کے بعد یہ کبوتر میرے قریب آ گئے اور دو چار دن اور گزرنے کے بعد تو میں انہیں پکڑ بھی لیتا تھا۔ انہیں گود میں بٹھاتا، چومتا اور پھر چھوڑ دیتا۔ ان کے ساتھ میرا وقت اچھی طرح گزرنے لگا۔ یہ بھی آنکھیں کھول کر مجھے اس طرح دیکھتے گویا پوچھ رہے ہوں "تم کون ہو۔۔؟ یہاں کیسے آ گئے ہو۔۔۔؟"

مہینوں یہ کبوتر میرے دوستوں کی حیثیت سے میرے آس پاس رہے، ان کے نیلے پر اور ان کی سرخ چونچیں اور ان کے گرم جسم اور سانس سے میں نے ہمیشہ اپنے لئے مسرت کا سامان پیدا کیا۔ ایک روز اچانک ایک جمعدار اس وقت میری کوٹھڑی میں داخل ہوا جب میں ایک کبوتر کو ہاتھ میں لئے پچکار رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "اوہو! اب اتنی دوستی ہو گئی ہے۔ ذرا ادھر تو لائیے"

میں نے کبوتر اسے دے دیا۔ تھوڑی دیر پچکارتے رہنے کے بعد وہ اسے ہاتھ میں لے کر احاطے سے باہر نکل گیا۔ میں نے اسے بہت پکارا مگر اس نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا اور باہر سے قفل چڑھا دیا۔

دروازہ کے پاس آ کر جب میں نے سلاخوں میں سے باہر دیکھا تو مجھے وہ جمعدار

ایک بلیڈ سے اس کبوتر کو ذبح کرتا ہوا نظر آیا۔ اپنے اس عزیز اور پیارے دوست کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں نے کوئی شور بھی نہیں کیا، بس چپ چاپ اندر آکر بیٹھ گیا لیکن میری وہ رات بڑی بے چینی کے عالم میں گزری اور اپنے اس دوست کو یاد کرکے میں بہت دیر تک روتا رہا۔ ایک چھوٹی سی خوشی تھی اسے بھی ظالموں نے ختم کر دیا۔ وہ کیسا پیارا اور بھولا پرندہ تھا۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا، وہ میرا دوست اور رفیق تھا۔ لیکن یہ جلاد اسے بھی مار کر ہضم کر گئے۔

اس حادثہ کے باوجود جب تک میں دوم تنہائی کے اس احاطہ میں رہا، کبوتروں سے میری دوستی باقی رہی۔

دو چار روز کے بعد ایک شام میرے احاطہ کا دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ ایک جمعدار غلام محمد (پھانسی والے) کو لئے میرے احاطہ کے باہر کھڑا ہے۔ غلام محمد کی آواز اور اس کی سزا کے متعلق مجھے چھ ماہ سے معلوم تھا مگر اس کی شکل میں نے اس روز دیکھی وہ ڈیرہ غازی خاں کا رہنے والا تھا اور اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی۔ چودہ ماہ پھانسی کی کوٹھری میں دن رات بند رہنے کی وجہ سے اسکا رنگ زرد، اور جسم بالکل بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ جب وہ میری کوٹھری کے ساتھ والی کوٹھری میں بند کیا جاتا تو ہمیشہ وہ مجھے بلایا کرتا تھا۔ میری اور اس کی گفتگو بہت دفعہ ہوئی تھی لیکن اس کی شکل اور اس کا مردہ جسم دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ آج جب وردی بدلتے وقت اس کو ایک کوٹھری سے نکال کر دوسری کوٹھری میں بند کیا جانے لگا تو اس نے جمعدار سے

بہت منت سماجت کر کے مجھ سے ایک منٹ کے لئے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ خواہش اس نے محض اس وجہ سے کی تھی کہ اسے کسی نے میرے متعلق یہ کہہ دیا تھا کہ میں سید ہوں۔ چنانچہ جب میں دروازہ کے پاس پہنچا تو اس نے میرے روکنے کے باوجود میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا، میرا ہاتھ چوما اور بولا " شاہ جی! میرے لئے دعا کرو میری رحم کی اپیل گئی ہوئی ہے۔ بس پھانسی نہ ملے، سزا چاہے چودہ سال کی ہو جائے وہ میں کاٹ لوں گا "

میری زبان پھر بند ہو گئی۔ حقیقت حال کا اظہار کرنے سے میری زبان نے پھر انکار کر دیا۔ میں اسے کیسے کہہ سکتا تھا کہ دعا میں کچھ نہیں رکھا۔ میں اس مردہ جسم سے جو چودہ ماہ سے مرگِ مسلسل میں مبتلا تھا، اس کی آخری امید کا سہارا کیسے چھین سکتا تھا۔ امید کی وہ ننھی سی شمع جو اس کے نہاں خانۂ دل میں لرز رہی تھی اسے بجھانا مناسب نہ سمجھ کر میں نے اس سے دعا کرنے کا وعدہ کیا اور اس کے جانے کے بعد واقعی میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کے لئے دعا مانگی اور اس کی نجات اور رہائی کے لئے رات بھر دعا کرتا رہا۔

اٹھائیس دسمبر کی شام کو آٹھ مہینے جیل میں رہنے اور چھ مہینے کی قید تنہائی کاٹنے کے بعد مجھے یکایک ایک کاپی اور قلم دوات رکھنے کی اجازت مل گئی۔ معلوم ہوا کہ حکومت نے ایک خط کے ذریعہ جیل والوں کو اطلاع دی ہے کہ ہمیں قلم، دوات اور ایک کاپی جس پر خود سپرنٹنڈنٹ صاحب صفحہ نمبر وغیرہ لگا ئیں دیدئے جائے

پھر اس پر یہ نگرانی بھی رکھی جائے کہ اس میں سے کوئی صفحہ پھاڑ کر ہم باہر نہ بھیج دیں۔ انتیس کی شام کو مجھے کاپی مل گئی تھی اور تیس کی شام کو قلم بھی مل گیا۔

اپنا قلم اتنی مدت کی جدائی کے بعد اپنے ہاتھ میں لے کر میں شرابیوں کی طرح مست ہو گیا۔ یہ قلم کتنی بڑی نعمت ہے۔ مجھے اس سے علٰحدہ کر کے یار لوگوں نے بالکل مار دیا تھا۔ اس روز اس قلم اور سفید کاغذ کو اپنے سامنے دیکھ کر میں جھوم اٹھا میں نے پاگلوں کی طرح کئی بار اس قلم کو چوما اور اپنے دل میں عہد کیا کہ اب کبھی تنہائی کی شکایت نہیں کروں گا اور اس ویران تنہائی میں اپنے اس قلم کی مدد سے خیالوں کے محل تعمیر کروں گا۔ اپنے تصور سے کرداروں کی ایک فوج بناؤں گا اور ان کیساتھ اپنا وقت گزاروں گا۔ ان کرداروں کی مدد سے میں کھیتوں میں ہل چلواؤں گا اور پھر لہلہاتی ہوئی فصلوں کو دیکھ کر جی خوش کروں گا۔ انہیں آپس میں محبت اور نفرت کرنے کا سبق دوں گا۔ ان میں سے بعض کو انسانی بلندیوں کے عروج پر لے جاؤں گا، اور بعض کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کے کفن دفن کا انتظام کروں گا اور پھر خیال ہی خیال میں ان کی تربت پر بیٹھ کر عقیدت کے دو آنسو بھی بہا دوں گا۔

اس روز قلم اور کاغذ ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہی مجھے اپنے سامنے بے شمار کردار قطار در قطار ہاتھ باندھے کھڑے نظر آئے۔ میں نے شطرنج کے کھلاڑی کی طرح ان کے رُخ متعین کئے، ان کے حدود مقرر کر کے میں انہیں آگے بڑھانے کی فکر ہی میں تھا کہ رات کا سناٹا ٹوٹ گیا۔

الارم

اس وقت رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔ قلم میرے ہاتھ میں تھا اور کاغذوں کی کاپی سامنے تھی۔ یکایک میرے احاطہ کے باہر پھانسی والوں کی کوٹھریوں کے سامنے سے ایک سیٹی کی آواز آئی، پھر دوسری سیٹی بجی، پھر ایکا یک بہت سی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد برج کا گھنٹہ مسلسل بجنے لگا۔ اس ہنگامے کو جیل کی اصطلاح میں الارم ہونا کہتے ہیں۔ الارم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جیل کے نظام میں کچھ گڑبڑ ہے، کوئی قیدی بھاگتا ہوا پایا گیا، یا کسی قیدی نے کسی افسر پر حملہ کر دیا، یا کسی نے خودکشی کی کوشش کی۔ الارم ہونے کے بعد یہ ضروری ہوتا ہے کہ تمام نمبردار اور سپاہی، خواہ وہ جیل کے اندر ڈیوٹی پر ہوں یا جیل سے باہر کوارٹروں میں، خطرہ کی جگہ پر پہنچ جائیں۔ جیل کے تمام افسر بمعہ ڈاکٹر صاحب کے خطرہ کے موقعہ پر پہنچتے ہیں۔ الارم ہونے کے بعد جمعداروں اور ملازم سپاہیوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ جسے بھی سامنے پائیں لاٹھیوں سے پیٹنا شروع کر دیں۔ جیل کے قانون کے مطابق الارم ہونے کے بعد اگر ملازم کسی قیدی کو مارتے مارتے ہلاک بھی کر دیں تو اس کا کوئی ہرج نہیں ہوتا۔

اس وقت الارم میرے احاطہ کے باہر سے شروع ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ خطرہ کہیں آس پاس ہے مگر اس کی نوعیت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکتا تھا

کیونکہ نہ صرف میری کوٹھڑی مقفل تھی بلکہ باہر کا احاطہ بھی بند اور مقفل تھا۔ چند منٹ کے اندر تمام ملازم لاٹھیاں لے کر آموجود ہوئے، نمبرداروں اور اسسٹنٹوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد "اٹن شن" کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی موقعۂ واردات پر پہنچ گئے ہیں۔

میں دیوار کے ساتھ کان لگا کر کھڑا تھا۔ باہر کی بات چیت سننے کے بعد معلوم ہوا کہ حیات محمد پھانسی والے نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ مگر حیرت یہ تھی کہ اتنی سخت نگرانی اور پہرہ کے باوجود وہ ایسی کوشش کیسے کر سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک نمبردار گشت کرنے کے لئے آیا تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ حیات محمد نے کمبل اوڑھ کر اپنا کرتہ اور پاجامہ اتارا اور ان کو پھاڑ کر ایک رسّی بنائی، پھر اس پھندے کو گلے میں ڈال کر وہ جنگلہ کے ساتھ لٹکنے کے لئے باندھ ہی رہا تھا کہ پہرے والے سپاہی کی نظر پڑ گئی اور اس نے الارم کے لئے وسل دے دیا۔ نمبردار ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ اس نے کہا "شاہ جی! دیکھو تو سہی، حیات محمد تو زندگی کے دُکھ سے تنگ آکر مرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ ڈاکٹر کمبخت کہتا تھا کہ حیات محمد مرنے کا بہانہ کر کے دودھ لگوانا چاہتا ہے۔ بھلا اس میں دودھ لگوانے کی کیا بات ہے ——"

اس گڑبڑ میں اس روز لکھنے کے پروگرام پر عمل نہ کر سکا۔ میری طبیعت سخت مکدر ہو گئی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ قانون حیات محمد کو وقت اور دن مقرر کر کے

باقاعدہ طور پر مارنا چاہتا ہے۔ اس غریب کو یہ اجازت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ مر کر اس مرگِ مسلسل سے نجات حاصل کر لے۔

میں اس رات، رات بھر حیات محمد کے متعلق سوچتا رہا۔ ابھی کل ہی تو وہ کہہ رہا تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنی بیوی اور بچوں کا خیال ہے۔ اسے زندہ رہنے اور اپنے بچوں سے آزادی کے ساتھ ملنے کی خواہش ہے۔ ابھی ایک ہی روز پہلے اس نے مجھ سے دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔ پھر یہ ایکا ایکی اسے کیا ہوا کہ اس نے پھانسی کا پھندا خود ہی اپنی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی۔ کیا امید کی وہ آخری شمع بھی بجھ گئی جو اسے ڈیڑھ سال سے اس سنگین کوٹھری میں زندہ رکھ رہی تھی۔

ملازموں نے حیات محمد کو پھر کوٹھری میں بند کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ کہہ رہے تھے کہ وہ حرامزادہ دودھ لگوانا چاہتا ہے لیکن وہ دوسرے افسروں کے ساتھ بغیر اس کا دودھ لگائے ہوئے چلے گئے۔

جیل میں پھر خاموشی چھا گئی۔ رات پھر گہری اور پراسرار ہو گئی۔ اس رات کسی نے بھی ماہیا گانے کی کوشش نہیں کی۔ پہرہ والے تینوں سپاہی کچھ دیر تو خاموش رہے پھر اسی طرح باتوں میں مشغول ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

”آج کی کوئی خبر سناؤ بھئی“ ایک سپاہی نے دوسرے سے کہا۔

دوسرا جو شاید اِدھر اُدھر سے روزانہ اخبار پڑھ کر آیا کرتا تھا بولا ”کوئی خاص خبر تو نہیں، آج کے اخبار میں لکھا تھا کہ بحرالکاہل بھی جنگ میں شامل ہو جائیگا“

"اچھا!" پہلے سپاہی نے کہا۔ "بحرالکاہل ہندو ہے یا مسلمان؟"

"نام سے تو مسلمان معلوم ہوتا ہے" دوسرے سپاہی نے کہا۔ اور پہلا اس پر مطمئن ہو گیا۔

جنوری کے شروع میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ صرف پیپل اور شیشم کے پتے تیزی سے گرنے لگے۔ میرا احاطہ روزانہ ان پتوں سے بھر جاتا۔ ہر طرف خزاں کا دور دورہ تھا، چاروں طرف عجیب حسرت آمیز مایوسی برستی تھی۔ درخت ویران ویران سے نظر آتے اور احاطہ کے درودیوار پر عجیب درد انگیز بیکسی چھائی رہتی۔ میرے دل میں ایسی اُجاڑ اور ایسی بے نام ویران لہریں اُبھرا کرتیں کہ انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان دنوں ساری فضا روتی ہوئی معلوم ہوتی۔ راتوں کو ہوا اتنے زور سے چلتی اور پتے ہوا کے زور سے اس طرح سائیں سائیں کرتے کہ میرا دل ڈوب جاتا۔ ایسی بے رحم تنہائی، اتنی بے نام کسک اور اس قدر مایوسی تھی کہ میں رات رات بھر جاگتا رہتا اور ہوا کے رونے پیٹنے اور چلّانے کی آوازیں سنتا رہتا اور یہ سوچتا کہ جس انسان نے اس کائنات میں سب سے پہلے کسی نغمہ کو جنم دیا ہے اس نے یقیناً درختوں کے پتوں اور ہوا کے رونے سے خیال لیا ہوگا۔ دنیا میں سب سے پہلا نغمہ انسان نے انہی آوازوں کو سننے کے بعد ایجاد کیا ہوگا۔ اور پھر جن حالات میں مجھے رکھا گیا تھا وہ بھی دنیا کے ابتدائی انسانوں کے رہن سہن سے مختلف نہ تھے۔

اس احاطہ میں کبھی کبھی آدھی رات کے وقت باہر کی دنیا کی آوازیں بھی پہنچ جاتی تھیں۔ احاطہ کے شمال مغرب کی طرف سے جیل کی آخری دیوار کہیں قریب ہی تھی۔ اس سے پرے غالباً کوئی راستہ تھا۔ رات کو اس راستے پر چھکڑے اور تانگے گزرنے کی آواز آتی تو میری روح تڑپ کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی اسی طرف سے کوئی نغمہ، کوئی گیت بھی بہتا ہوا میری طرف آ نکلتا۔

پیر جھنڈے شاہ

انہی دنوں مجھے "ملتان کی تاریخ" کے نام سے ایک کتاب پڑھنے کو مل گئی۔ اس کے مطالعہ سے منجملہ اور باتوں کے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس جگہ پر ڈسٹرکٹ جیل ملتان واقع ہے وہاں پر کسی زمانے میں ایک بزرگ جھنڈے شاہ فقیر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے مریدوں سے کہا کہ جس جگہ میں بیٹھا ہوں، وہاں دوزخ تعمیر ہوگا۔ چنانچہ ان کے انتقال کے چند ہی روز بعد وہاں پر ڈسٹرکٹ جیل ملتان تعمیر ہوئی۔ کتاب میں یہ بھی درج تھا کہ پیر جھنڈے شاہ فقیر کا مزار بھی جیل کے اندر ہی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر سب سے پہلے تو مجھے پیر صاحب پر غصہ آیا جو خود تو جنت میں ہیں جا بیٹھے ملا ہمارے لئے یہ دوزخ تعمیر کرا گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے ان کے مزار کے متعلق بھی تشویش ہوئی۔ اگلے روز شام کو راجہ صاحب آئے۔ ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پیر صاحب کا مزار میرے احاطہ کے بالکل ساتھ ہی جنوب کی طرف واقع ہے

میں چونکہ احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے چھ سات مہینوں میں مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا تھا۔ اس روز آدھی رات کے وقت میں نے اپنی کوٹھڑی سے پیر جھنڈے شاہ کو پکار کر کہا "حضرت صاحب! میں تو سیاسی نظربند ہوں کیا آپ بھی نظربند ہیں۔ آپ کے پڑوس میں سات ماہ سے تنہا پڑا ہوں۔ آپ نے ملاقات کے لئے آنا مناسب نہ سمجھا۔ اچھا! آپ نہیں آئے تو ہم بھی وضعدار ہیں، آپ کے پاس آنے کی پہل ہم بھی نہیں کریں گے"

میری یہ پاگل پن کی بات سُن کر غلام عیسٰے پھانسی والے نے آواز دی "شاہ جی! کس سے بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "ذرا جھنڈے شاہ سے بات کر رہا تھا"

بے چارے غلام عیسٰے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو گھبرا کر وہ اپنا گانا گانے میں مصروف ہو گیا۔

تیس جنوری کو راجہ صاحب مسکراتے ہوئے احاطہ میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا جس میں حکومت پنجاب نے لکھا تھا کہ "حمید اختر ولد الیس رحمت علی کو آج سے اے کلاس نظربند سمجھا جائے"

جیل میں آٹھ مہینے بند رہنے کے بعد مجھے گویا آخرکار ترقی مل گئی تھی۔

اگلے روز مجھے ایک چارپائی، ایک میز کرسی، کھانا پکانے کے لئے ایک مشقتی اور بہتر راشن ملنے لگا۔

کلاس ملنے سے مجھے خوشی کم اور تکلیف زیادہ ہوئی۔ دسمبر کے مہینے میں فیروزالدین منصور، محمد افضل، یامین اور کچھ دوسرے رفیق رہا ہو چکے تھے۔ مجھے کلاس ملنے کا مطلب یہ تھا کہ ابھی مجھے رہا نہیں کیا جائے گا۔ بہر حال اس کے بعد میں بہتر اور آرام دہ زندگی گزارنے لگا۔

جس روز مجھے کلاس ملی، اس سے اگلی شام کو غلام محمد پھانسی والے کی آخری ملاقات آگئی۔ غلام محمد کو ملنے والوں میں اس کی بہن بھی تھی۔ میں نے اسے اپنے دروازے کے سوراخوں میں سے دیکھا۔ وہ بالکل حواس باختہ اور بوکھلائی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے سر کے بال کھلے تھے اور اس کی کھلی آنکھیں حیران اور غم سے بھری ہوئی تھیں۔ یکایک اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر مارے اور چلا کر بولی "میرا ویریا! میں تجھے اس کے بعد کہاں ڈھونڈھوں گی؟"

غلام محمد چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ دروازے کے سوراخوں میں سے مجھے اس کے چہرے کا صرف ایک ہی حصہ نظر آرہا تھا۔ اس کی بہن چلانے کے بعد گر پڑی اور بیہوش ہو گئی۔ پھر اس کی بیوی اور دوسرے رشتہ دار آگئے۔ سب مل کر رخصت ہو گئے۔ مگر وہ بُت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اس رات جیل کا پورا ماحول سازشی سا نظر آتا تھا۔ پہرہ والے بہت چُست تھے افسر لوگ رات کو بار بار چکر لگاتے رہے۔ رات بھر موت در و دیوار پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی رہی۔ رات بھر میں زندگی اور موت کے فلسفہ پر غور کرتا رہا۔ ساری رات مجھے یوں

معلوم ہوتا رہا گویا میں خود پھانسی کے تختہ پر لٹک رہا ہوں ۔ یہ تصور کہ صبح سویرے ایک جیتا جاگتا انسان مار دیا جائے گا، میرے اعصاب پر سوار تھا۔ موت مجھے اپنے آس پاس کہیں بالکل قریب محسوس ہو رہی تھی ۔ موت کے استقبال کی تیاریاں کس قدر زور شور سے ہو رہی تھیں ۔

صبح چار بجے پانی کی بالٹی غلام محمد کو دے دی گئی ۔ اس نے خاموشی سے غسل کیا اور پھر وہ اسے اس کی کوٹھڑی سے نکال کر پھانسی گھر کی طرف اس کے آخری سفر پر لے کر روانہ ہو گئے ۔ غلام محمد نے مجھے آواز دے کر کہا "شاہ جی! میری بخشش کی دعا کرنا "

ابھی پندرہ روز پہلے وہ اپنی رہائی کی دعا کرنے کو کہہ رہا تھا، آج وہ مجھے بخشش کی دعا کرنے کے لئے کہہ رہا ہے ۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا ۔ مجھ میں بات تک کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی ۔

ساڑھے چار بجے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور چھ بجے اس کی لاش اس کے ورثاء کے حوالے کر دی گئی ۔

پھر تین ہی روز بعد ایک اداس شام کو حیات محمد کے گھر والے اس سے ملنے کیلئے آ گئے ۔ پھانسی والوں کو آخری ملاقات سے پہلے تک یہ نہیں بتایا جاتا کہ ان کو مارنے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے ۔ انہیں اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب ان کے وارث، عزیز، رشتہ دار روتے پیٹتے ان کے پاس آ جاتے ہیں ۔ اس منحوس ہفتہ میں یہ دوسرا واقعہ تھا ۔ اس رات بھی موت اسی طرح

چاروں طرف پھیل گئی ۔ اس رات بھی میں سو نہیں سکا اور رات بھر تڑپتا رہا۔ یہ سب اکیلے موت کے غاروں میں دھکیلے جا رہے تھے مگر مجھے ہر ایک کے ساتھ موت کے گھاٹ اترنا پڑتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اور اب بھی میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا تھا گویا ان کی بجائے میں پھانسی کے تختہ پر لٹک رہا ہوں ۔

حیات محمد کی ملاقات ختم ہو گئی، گنتی بند ہو گئی۔ اس رات کسی نے نہ تو کوئی تان لگائی اور نہ ہی کوئی کسی سے بات چیت کر رہا تھا۔ بس ہر طرف خاموشی اور ویرانی تھی اور موت کے استقبال کی تیاریاں تھیں۔ سپاہی پہرے پر پہلے سے زیادہ چستی کا مظاہرہ کر رہے تھے حیات محمد نے اس رات اپنا وہ گانا بھی نہیں گایا:

اساں تیتھوں کی لینا ں

فکر نہ کریں چن وے

سدا کوٹھیاں نئیں رہناں

وہ دس بجے رات تک خاموشی سے لیٹا رہا۔ دس بجے کے قریب اس نے پہرے والے سپاہی کو مخاطب کر کے اس سے قرآن شریف فراہم کرنے کیلئے کہا۔ دو منٹ میں نمبردار نے اسے قرآن شریف دیدیا ۔ حیات محمد نے قرآن پڑھنا شروع کیا ۔ پہلے تو اسکی آواز کافی بلند تھی مگر آہستہ آہستہ مجھے یوں معلوم ہوا گویا اس آواز میں سے اس کی رطوبت اور تری نکل گئی ہے اب یہ آواز بالکل خشک اور خالص آواز تھی۔ اس میں کسی جذبے، کسی خیال اور کسی احساس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ حیات محمد قرآن شریف اسطرح پڑھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے خیالوں سے

بچنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اپنے اندیشوں اور اپنی مصیبتوں کے خیال سے بچنے کیلئے وہ قرآن پڑھتا رہا۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد اس نے قرآن شریف بند کر دیا اور خاموشی سے پختہ فرش پر لیٹ گیا ۔ میں اس دوران میں اپنی کوٹھڑی میں فرش پر ٹہلتا رہا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں جنم جنم سے یہیں ٹہل رہا ہوں، اسی درد اور اسی کرب میں مبتلا ہوں۔ یہ رات کیسے گزریگی ۔ موت کی وادیوں میں جانے والے مسافروں کے درمیان میں تنہا یہاں کس لئے پڑا ہوں میری منزل کہاں ہے ؟ اور ان کی منزل کونسی ہے ؟ یہ سب سوچتا اور اپنے دکھ میں لپٹا ہوا میں ٹہلتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا گویا میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا جا چکا ہے اور مجھے بھی آج کی رات ہی حیات محمد کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کر جانا ہے ۔

بارہ بجے اس نے مجھے آواز دی "شاہ جی ! سو گئے ہو ؟"

میں اس سے ڈر رہا تھا اور اس کیساتھ باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے جس محبت سے مجھے بلایا تھا اس کی وجہ سے میں نے مختصر سا جواب دیدیا "نہیں حیات محمد! جاگ رہا ہوں"

"شاہ جی ! میرے لئے دعا کرنا خدا مجھے بخش دے، میں گنہگار ہوں، میں نے اپنی عورت کیلئے قتل کیا تھا مگر اب میری عورت کیا کریگی میرے بچے کیا کرینگے ؟ میری ساری زمین، ہمارا پورا گھر بک گیا ہے اور میرے مقدمہ پر ہمارا سب کچھ لگ چکا ہے، اب انکا میرے بعد کیا ہوگا ؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ میں جواب دے بھی کیا سکتا تھا میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں جب بھی وہ بند ہوتا ہمیشہ اپنے گھر والوں کی باتیں کرتا تھا، امید ظاہر کرتا تھا کہ وہ بچ جائیگا ۔ میں ہمیشہ اسے تسلی دیا کرتا تھا کہ تم رہا ہو جاؤ گے ۔ آج سارے راستے

ختم ہو گئے تھے، ساری امیدیں مٹ گئی تھیں۔ اب میں اسے کیا کہوں۔ اب میں کیسے اسے تسلی دوں۔ جس سفر پر وہ روانہ ہو رہا ہے اسکے بارے میں کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

حیات محمد کافی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ لاالہ کا ورد شروع کر دیا اس کی آواز ڈوبی ہوئی اور کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ گہرا کنواں خود اسکی زندگی اور اسکی اپنی مصیبتوں کا تھا جس میں سے نکلنے کیلئے آج اس کی روح مضطرب تھی۔

دو بجے کے بعد اس نے مجھے پھر بلایا "شاہ جی! ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا تو وہ بولا "شاہ جی! میرا کہا سنا معاف کرنا، میرا تو اب وقت قریب آ رہا ہے"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دل بھر آیا تھا۔ خاموشی سے میں نے اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیا۔ یہ ایسا نازک اور اسقدر دردناک وقت تھا کہ مجھے اپنے جسم میں چھریاں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری فضا مجھے ڈس رہی ہے۔ رات کے ایک ایک لمحہ کو میں نے اپنے اوپر وار کرتے ہوئے پایا۔

تین بجے کے بعد حیات محمد کی آواز میں ایک سکون سا آ گیا۔ وہ اب محض زبان کی حرکت سے کلمہ پڑھ رہا تھا ورنہ اس کی آواز میں دور دور تک زندگی کا نشان نہ ملتا تھا۔ کلمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے دیوار پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اس کا ہاتھ دیوار پر سرسراتا رہا۔ گویا وہ اپنی زندگی کی ساری روشنی اور حرارت اور اپنی تمام امنگیں اور خواہشیں اس دیوار میں سمیٹنا چاہتا ہو۔ مجھے دیوار پر اس کے ہاتھ پھیرنے کی آواز سن کر ایسا معلوم ہوا۔ گیا اس کے ہاتھ باتیں کر رہے ہیں، کوئی پیغام دے رہے ہیں اور دیوار بول رہی ہے۔

پونے چار بجے کے قریب اسے پروگرام کے مطابق پانی کی بالٹی دے دی گئی۔ اس نے غسل کیا اور چار بجے اسے کوٹھری سے نکال دیا گیا۔ پھر پھانسی کی کوٹھریوں سے اس کو پھانسی گھر کی طرف لیجایا جانے لگا تو اس نے سب کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا "بھائیو! کہا سنا معاف کرنا، السلام علیکم" یہ کہہ وہ علی علی کے نعرے لگاتا ہوا اپنے سفر کی آخری منزل کے لئے چل پڑا۔

پھانسی گھر کے راستے پر میری مضطرب روح بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ میں نے حیات محمد کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ میں نے اس کا جسم، اس کی آنکھیں، اس کا ناک نقشہ کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا ایک دیوار کے فاصلے پر ایک ساتھ آٹھ مہینہ ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود میں نے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن ہماری آوازوں کی ملاقات روزانہ ہوتی تھی، آج وہ بھی ختم ہو گئی۔ حیات محمد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انسانوں نے ایک قتل کے جرم میں ایک اور قتل کر دیا تھا۔ کتنا انوکھا اور کتنا ظالمانہ طریقہ ہے۔ کاش ہم سوچ سکیں کہ حیات محمد نے قتل کیوں کیا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اسکی جہالت، اس کی صدیوں کی معاشی غلامی، اس کے وحشیانہ جذبات جنہیں تہذیب کی بھٹی میں جلا کر قابو میں رکھنا نہیں سکھایا گیا تھا، بھی اس قتل کے ذمہ دار تھے جو حیات محمد نے کیا تھا۔ یہ قتل سماج کی ذمہ داری ہے۔ وہ سماج جس نے حیات محمد کو جنم دیا اور قتل کرنے تک کی عمر اور عقل تک پہنچایا وہ اس کی ذمہ دار ہے۔ پھر اس قتل کے بعد اس قتل کے لئے ایک اور آدمی کیوں مار دیا گیا؟

میرے یہ دن بہت بُرے گزرے، یہ دن تھے بھی بہت بُرے، دن بھر سرد تھکا دینے والی ہوائیں چلتیں اور شیشم کے پتّے گرتے رہتے، دن بھر اور رات بھر فسردہ، اُداس نغمے فضا میں گونجتے رہتے۔ راتوں کی خاموشی میں میں حیات محمد کے وہ گیت یاد کیا کرتا تھا جو وہ گاتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا "سدا کوٹھیاں نئیں رہناں" اب کیوں نہیں گاتے ہو حیات محمد تم کہاں ہو؟"

میں ان دنوں حساب لگاتا رہتا کہ مجھے زندگی کی مسرتوں سے علیحدہ ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔ اس وقت تک تقریباً دس ماہ ہو چکے تھے۔ یہ دس مہینے میری زندگی میں ایک صاف سلیٹ کی طرح تھے۔ ان میں نہ تو میں نے کسی سے محبت کی اور نہ کسی سے نفرت۔ اس عرصے کا میری زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ مدت میری زندگی میں شامل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں نہ کوئی آنچل میرے قریب لہرایا اور نہ ہی میں نے کسی جسم کی آنچ محسوس کی۔ نہ ہی میں نے حرارت اور حُسن کا کوئی شعلہ بھڑکتا ہوا دیکھا۔ کوئی لطیف آواز، کوئی نغمہ، کوئی بھی حرارت نہ تھی۔ یہ سارا عرصہ نہ تو میرے لئے پھول کھلے اور نہ ہی بہار کے کسی نغمے نے کہیں جادو جگایا۔ کوئی شیریں آواز، کوئی صدا، کوئی سحر نہیں تھا جو اس لق و دق صحرا میں میرا ساتھ دیتا۔ اس عرصہ میں بہت سے قیدی رہا ہوئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو قیدِ حیات ہی سے رہا ہو گئے مگر میں ابھی تک بند تھا۔ زندگی سے محروم تھا، روشنی سے محروم تھا۔ آخر کیوں؟

یہ وہ زمانہ تھا جب کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں اور بہار فتنے جگاتی ہے، جب دیوانے اپنے گریبان چاک کرتے ہیں اور جب سرسوں پھول جاتی ہے اور سرسوں کے کھیتوں میں شفق تک زردی ہی زردی ہوتی ہے۔ بسنت کی زردی جو بہار کا رنگ ہوتی ہے اور جو شاموں کی شفق کی سُرخیوں سے مل کر مسرتوں کے گیت گاتی ہے مگر میں نے زمین اور آسمان کے ملنے کی جگہ اور شفق کی سُرخی کو ایک مدت سے نہیں دیکھا تھا۔

موت کی وادیوں میں

حیات محمد کی موت کے کوئی ہفتہ بھر بعد ایک شام جیل میں پھر وہی سازشی ماحول نظر آنے لگا جو موت کی وادیوں کا ماحول ہے۔ اس شام جیل کے افسروں تک کے چہرے گہری فکر و تشویش میں مبتلا نظر آتے تھے۔

جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کل صبح مرید خاں، اس کے بھائی لال خاں اور نصیر خاں، اور غلام عیسٰے چاروں کو پھانسی دی جانے والی ہے تو میرا ذہن پاگل پن کی حدوں کو چھونے لگا۔ بہتر کلاس ملنے سے پہلے مجھے یہ کہا جاتا تھا کہ مجھے اور حسن عابدی کو اس لئے ایک ساتھ نہیں رکھا جاتا کیونکہ میں سی کلاس میں ہوں اور وہ بی کلاس میں، اب مجھے مہینہ بھر سے بہتر کلاس ملی ہوئی تھی لیکن میرے زور دینے پر معلوم ہوا کہ حکومت نے ہمیں الگ رکھنے ہی کے لئے حکم دیا ہوا ہے۔ یہ جواب سُن کر میں خاموش ہو گیا تھا مگر اس شام میں نے حقیقتاً بڑی منّت سماجت سے جیل کے افسروں سے

درخواست کی کہ مجھے حسن عابدی کے پاس رہنے دیا جائے یا جیل کے کسی اور حصے میں تبدیل کر دیا جائے کیونکہ اگر میں یہیں پر رہا تو مر جاؤں گا۔ میری بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا اور سب اپنی مجبوری ظاہر کر کے رخصت ہو گئے۔

اس شام جب مرید خاں، لال خاں، نصیر خاں اور غلام عیسےٰ کے عزیز ان سے آخری ملاقات کرنے کے لئے آنے لگے۔ اس وقت میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ آخری ملاقات کے وقت مرنے والے کے عزیز رشتہ دار اور دوست سولہ تک کی تعداد میں آ سکتے ہیں۔ چونکہ اس روز تین بھائی یعنی مرید خاں، لال خاں اور نصیر خاں کے علاوہ ایک چوتھا غلام عیسےٰ بھی تھا اس لئے ان کی ملاقات کرنیوالے ستر کے قریب مرد عورتیں جیل کے اندر تھے۔ انہیں چار چار چھ چھ کر کے مختلف گروہوں میں پھانسی کی کوٹھڑیوں کے درمیان لایا جا رہا تھا۔ جیل کے تمام افسر موقعہ کی نزاکت وجہ سے اس جگہ پر موجود تھے اور یہ آخری ملاقات ہو رہی تھی۔

اس دن دوپہر ہی سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا چنگھاڑتی اور روتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ پتے گر رہے تھے۔ جیل میں پتے ہمیشہ ہی گرتے رہتے ہیں۔ پورا ایک سال جیل میں رہ کر میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جیل کے درختوں سے پتے ہر موسم اور ہر رُت میں گرتے رہتے ہیں۔

اس شام میں مستقلاً دروازے کے پاس کھڑا دروازے کی درزوں میں سے

جھانک جھانک کر مرنے والوں اور ان کے ملاقاتیوں کو دیکھتا رہا۔ مرنے والے اور ان سے ملنے والے سبھی پھٹے حالوں تھے۔ سب گاڑھے کے تہمد اور کرتے پہنے ہوئے تھے۔ سبھی کے چہروں پر موت کے نقش ابھرے ہوئے نظر آتے تھے، ہر آنے والے کے چہرے پر اداسی اور اضطراب نظر آتا تھا۔

چار چار کی ٹولیوں میں وہ ڈیوڑھی سے آ کر پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے بیٹھ جاتے۔ پانچ منٹ تک باتیں کرتے، اپنے پلوؤں سے اپنی آنکھیں پونچھتے اور مرنے والوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاتے۔ شام گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا رات قریب آ گئی تھی مگر میر خاں، لال خاں، نصیر خاں اور غلام عیسےٰ کی کوٹھڑیوں کے سامنے چار چار آدمی بیٹھے تھے اور اپنے ان رفیقوں کو رخصت کر رہے تھے، جو انجانی منزلوں اور ان دیکھی راہوں کی طرف روانہ ہونے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

اس دوران میں ایک بار ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ میں نے دیوانگی میں دروازوں کو اتنے زور سے کھینچا کہ میرے احاطہ کا یہ بوسیدہ دروازہ اُکھڑتے اُکھڑتے بچا۔ اس طرح میں نے دونوں دروازوں کے درمیان اتنا فاصلہ کر لیا کہ اب میں آسانی سے باہر نظر ڈال سکتا تھا۔ چیخنے والی عورت غلام عیسےٰ کی کوٹھری کے سامنے اپنے ننھے سے بچے کو لئے کھڑی تھی۔ اس کی گود میں اس کا وہ ننھا بچہ تھا جو غلام عیسےٰ کے جیل میں آنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ بچہ تھا جسے غلام عیسےٰ آج تک گلے سے نہیں لگا سکا تھا۔ یہ وہ بچہ تھا جس نے اپنے ایک سالہ زندگی میں کبھی اپنے

اس باپ کی گود کی گرمی کو نہیں محسوس کیا جو آج ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے جارہا تھا۔ غلام عیلے کی عورت چیخ رہی تھی اور اس کا بچہ بے خبر تھا اور مسکرا رہا تھا یہ عورت بمشکل بیس بائیس سال کی ہوگی۔ اس نے تہمد باندھا ہوا تھا اور ڈبل کی سیاہ قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں تعویذوں کی ایک لڑی اور ایک کنٹھا لٹک رہا تھا۔ یہ کنٹھا جو اس کے سہاگ کی یادگار تھی جسے پہن کر وہ دلہن بنی اپنے دولھا سے ملی ہوگی مگر آج یہ کس کی بارات میں کون سے دولھا کو رخصت کرنے آئی ہے۔ دنیا کی رسم تو یہ ہے کہ دلہنیں رخصت ہوتی ہیں۔ دلہنیں اپنے سفر پر روانہ ہوتی ہیں اور نئی دنیائیں آباد کرتی ہیں لیکن یہ ایسا انوکھا دن تھا کہ اس کی ایک شام میں ایک دلہن اپنے دولھا کو اس سفر پر روانہ کرنے آئی ہے جس سے وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، جس کے کبھی واپس آنے کی کوئی امید نہ تھی۔

غلام عیلے کو بھی میں نے آج ہی دیکھا تھا۔ وہ بیس پچیس سال کا تنومند نوجوان تھا۔ اس کے جسم میں زردی اور موت کے خوف کی آمیزش کے باوجود چٹانوں کی پختگی نظر آتی تھی۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ کبھی زندگی میں، کھلے کھیتوں کے درمیان اس نے الغوزے بجا کر اور بانسری کی تانیں اڑا کر اس عورت کا دل موہ لیا ہوگا جو آج اس کے سامنے بت بنی کھڑی تھی۔ یہ عورت جو پھول اور بہار اور خوشبو لاتی ہے، آج اپنے پریتم کے لئے آہوں اور سسکیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ لائی تھی۔

دفعتاً غلام عیسیٰ نے دروازے کی سلاخوں میں سے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اپنے بچے کو پکڑ لیا۔ مگر وہ اسے اپنے سینے کے ساتھ نہ لگا سکا۔ کیونکہ اس کے اور اس کے خون کے درمیان لوہے کا منحوس کٹہرہ حائل تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ کھول کر بچے کو چومنے کی کوشش کی، مگر اس کا ماتھا لوہے کے جنگلے سے ٹکرا گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی عورت جو پاس ہی کھڑی تھی، چیخ مار کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ گرنے اور بے ہوش ہونے کے بعد اس کے ہونٹ ایک بار پھر ہلے اور پھر ایک دوسرے سے مل گئے۔ فروری کی اس سہانی شام میں یہ حسینہ پتھر کے ننگے اور بے رحم فرش پر اپنے شوہر کے جنگلے کے بالکل سامنے بے ہوش پڑی تھی اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی اور اس کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کی زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور وہ بے ہوشی میں لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کا مجازی خدا جنگلے کے پیچھے کھڑا اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کا ایک سالہ بچہ اس کے ان ہاتھوں میں لٹک رہا تھا جو جنگلے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد عورت ہوش میں آ گئی۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے اس نے اپنے ہونٹ وا کئے۔ یہ ہونٹ جن پر اب اس کا محبوب کبھی اپنے ہونٹ ثبت نہ کر سکے گا۔ پتلے اور نازک اور شاداب ہونٹ جن میں زندگی اور حسن اور حرارت تھی۔ یہ ہونٹ کھلتے اور بند ہوتے رہے۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنے سینے پر ایک دو ہتڑ مار کر چلائی "غلام عیسیا! اس کے بعد میں تجھے

کبھی زندہ نہیں دیکھوں گی، اب مجھے تیری لاش ہی ملے گی ــــ"

جیل کے افسروں اور جمعداروں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی، اسے سمجھانے اور چمکارنے، پچکارنے کی کوشش کی مگر وہ ایسی آنکھوں سے ان سب کو، اور اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھی گویا اس کے کانوں میں کوئی آواز نہیں پہنچ رہی، گویا وہ ان میں سے کسی کو نہیں پہچانتی۔

آہستہ آہستہ وہ اسے کندھے سے پکڑ کر لے گئے۔ غلام علی بھرائی کوٹھری کے پچھلے حصہ میں چلا گیا۔ باقی کے سب ملاقاتی بھی چلے گئے۔ رات ہو گئی، گنتی بند ہونے لگی۔ تالے بجنے لگے، زنجیروں اور کٹھروں کی اس دنیا کو رات کی سیاہی نے اپنے تسلط میں لے لیا۔ چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔

اس روز بھی "سب اچھا" ہو گیا۔ روزمرہ کے معمول کے مطابق اس رات بھی برج کا نمبردار پکارتا رہا اور نمبردار "سب اچھا" کہتے رہے۔ کئی بار برج کے نمبردار نے دوم تنہائی کی پکار لگائی اور کئی بار دوم تنہائی کے نمبردار نے "سب اچھا" کہہ دیا مگر اس رات سارے قیدی خاموش رہے۔ قصوری قیدی جو چکیوں میں بند تھے خاموش رہے ـــ پھانسی والے جو کل صبح موت کی وادیوں میں جانے والے تھے، خاموش رہے۔ وہ پھانسی والے بھی جو ابھی موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے، خاموش رہے، اور ان سب کے نگران پہرہ والے سپاہی بھی خاموش رہے۔ صرف ہوا چلتی رہی اور روتی رہی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، کبھی کبھی بادل چھٹتے

تو مجھے اپنی سلاخوں میں سے کوئی ننھا سا ستارہ ٹمٹماتا ہوا نظر آجاتا۔ پھر اندھیرا بڑھ جاتا۔ پھر فضا کی سنگینی اور بھی پُراسرار، اور بھی گھری اور تکلیف دہ ہو جاتی۔ رات کی تاریکی اور اس کا جادو بڑھ جاتا۔

اپنی کال کوٹھری میں لیٹے لیٹے میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ آج جو ہوا چل رہی ہے وہ کل بھی چلے گی اور آج ستاروں کی جو شمعیں جل رہی ہیں وہ کل بھی جلیں گی۔ مگر آج کی ہوا میں یہ دیوانگی، یہ سرگوشی کیسی ہے؟ فطرت اپنے سارے حربے آزما رہی ہے، فطرت اپنے سارے خزانے لٹا رہی ہے اس لئے کہ کل جس صبح کا اجالا ہوگا اور جس ہوا کی نرمی اور جس فطرت کی خوبصورتی سامنے آئے گی اس میں مرید خاں، لال خاں، نصیر خاں اور غلام عیلے کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ سورج کی جو سنہری کرن کل صبح دنیا میں قدم رکھے گی اس کی آنکھ ان کی لاشوں کو دیکھے گی اور ان کے چاہنے والوں کی گریہ زاری اور آہ و بکا سنے گی۔

رات بھر ہوا روتی رہی۔ رات بھر بادل آسمان کی نیلی چادر اور اس کے روشن ستاروں کو اپنے لبادوں میں لئے اڑتے رہے، رات بھر میں اپنے جنگلے کو پکڑ کر بیٹھا رہا اور رات بھر میں نے پھانسی کے رسے کو اپنی گردن میں پایا۔ اس رات میں جانے کتنی بار مرا اور پھر زندہ ہوا۔ دوبارہ مرنے کیلئے ــــ موت آگئی تھی اور آس پاس دبے قدموں پھر رہی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ اور اس کی گرفت میری اپنی گردن کے گرد تھی۔ کتنا گھرا سناٹا تھا جیسے ہوا کی چیخیں توڑ توڑ کر پھینک رہی تھیں، مگر یہ سناٹا اور بڑھتا تھا۔

اور سنگین ہو جاتا تھا۔

جب رات دو پہر کے قریب گذر گئی تو مرید خاں نے غلام عیلے کو پکار کر کہا۔

"غلام علیسا! کوئی بات کر، تو چپ کس لئے ہے؟"

غلام عیلے نے کہا "مرید خاں! کیا باتیں کروں؟ آج ساری باتیں ختم ہو گئی ہیں۔"

مرید خاں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہا "غلام عیلے! تو گھبرا تو نہیں رہا ——؟"

"نہیں مرید خاں! میں گھبراتا نہیں، موت برحق ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں، میری بیوی ابھی بہت چھوٹی ہے، اس کے سامنے تو ساری عمر پڑی ہے، وہ کیا کریگی —؟"

مرید خاں نے اس دن اپنا "اللہ رحم کریگا" والا فقرہ نہیں دہرایا۔ وہ خاموش رہا۔

غلام عیلے نے پھر کہا "مرید خاں! تم نے میری عورت کو دیکھا تھا؟"

"ہاں!" مرید خاں نے کہا۔

"تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں؟"

"نہیں"

"تم دیکھتے تو سہی، اس کی آنکھیں ہرگ کی آنکھوں جیسی ہیں۔ جب جاتے وقت وہ مجھے دیکھتی تھی تو میرا جی چاہتا تھا ان آنکھوں میں بیٹھ جاؤں۔ مرید خاں! ان میں آنسوؤں کے سمندر تیر رہے تھے، اس کا کیا بنے گا مرید خاں!"

مرید خاں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "غلام عیلے! رب نوں یاد کر۔"

غلام علیؔ خدا کو یاد کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ دیر تک کچھ پڑھتا اور دیوار پر ہاتھ پھیرتا رہا۔
لال خاں نے غلام علیؔ کو آواز دے کر کہا "ذرا پکار کر دیکھ کہ شاہ جی جاگ رہے ہیں؟"
"نہیں سو گئے ہیں" غلام علیؔ کی آواز آئی۔
مجھے ایسا معلوم ہوا گویا غلام علیؔ نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مرنے والوں کا ساتھ دینے کیلئے کون جاگتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا میں اپنے بستر پر آرام سے لیٹا ہوا سو رہا ہونگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے میں نے پکار کر کہا "غلام علیؔ! میں جاگ رہا ہوں"
"اچھا تو پھر ہماری بخشش کی دعا کرنا شاہ جی! ہمارا وقت تو قریب آ رہا ہے"
تھوڑی دیر کے بعد میں نے مرید خاں سے پکار کر کہا "مرید خاں! وہ تمہارا ڈاچی والا گیت سننے کو بہت جی چاہتا ہے"
مرید خاں کھوکھلی اور بے روح سی ہنسی ہنسا۔ پھر اس نے اپنی پاٹھ دار آواز میں گانا شروع کیا

"ڈاچی والیا موڑ مہار وے ــــ ڈاچی والیا موڑ مہار وے"

لیکن ڈاچی والے کو اس کی سسّی رخصت کر کے جا چکی تھی۔ ہیر اپنے رانجھے کو سر شام ہی رخصت کر گئی تھی۔ اب ڈاچی والا کیسے واپس آئیگا۔ اس کی مہار اس کے قابو میں نہیں تھی۔ وہ تو اپنے آخری سفر پہ روانہ ہو رہا تھا ــــ خاموشی چھا گئی۔
معمول کے مطابق پونے چار بجے جیل کا تمام سٹاف پہنچ گیا۔ مرنے والوں کو زندگی ہی میں نہلا دیا گیا۔ پھر انہیں ان کی کوٹھڑیوں سے نکال لیا گیا۔ وہ قطار میں سپاہیوں کی حفاظت میں پھانسی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

روانہ ہونے سے پہلے مرید خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کر رہا تھا کہ "ہم تینوں بھائیوں اور غلام عیسےٰ کو ایک ہی بار تختے پر کھڑا کیا جائے اور ایک ہی بار جھٹکا دیا جائے۔ غلام عیسےٰ بھی ہمارا بھائی ہے۔"

ان کی درخواست منظور ہو گئی تو مرید خاں نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور "السلام علیکم، کہا سنا معاف کرنا" کہہ کر اپنے قافلہ کے ساتھ موت کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح سپاہیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ان چاروں کو تختے پر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ سب باتیں کرتے رہے۔ صرف لال خاں تختے پر کھڑا ہونے کے بعد ایکبار کپکپایا مگر اسکے بھائی مرید خاں نے اسے اپنی کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا "لال خاں! ہمت سے کام لو اور مردوں کی موت مرو" پھر وہ چاروں مردوں کی موت مر گئے۔

میں دن بھر یہ سوچتا رہا کہ یہ کونسا جذبہ ہے جو انسان کو ہنستے کھیلتے موت کی وادیوں کی طرف لیجاتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی مقصد کوئی نصب العین، شہادت کا کوئی تصور نہیں تھا پھر بھی وہ ہنستے ہوئے مر گئے۔ قبائلی زندگی اور اس کی روایتوں کے ابھی کتنے نشانات ہمارے سماج میں موجود ہیں۔

اس ایک ہفتے میں غلام محمد، حیات محمد، مرید خاں، لال خاں، نصیر خاں اور غلام عیسےٰ سب مارے گئے۔ ان کی جگہ نئے لوگ آ گئے۔ پھانسی کی کوٹھریاں پھر پر ہو گئیں مگر تمام قیدی اور پرانے حوالاتی اور ملازم ان مرنیوالوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے حیات محمد کے ماہئے اور غلام عیسےٰ کے ڈھولے اور مرید خاں کی ڈاچی کا گیت سب ختم ہو گئے تھے۔ ڈاچیوں والے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے مرنیوالے تو مر کر غم سے نجات پا گئے تھے مگر جو زندہ تھے وہ ابھی اپنی اپنی تقدیر کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔

فروری کا پورا مہینہ میں اپنے وجود سے ان کے خیال کو علیحدہ نہ کر سکا۔ سردی کم ہو رہی تھی مگر ہوائیں ایسی اُداس تھیں اور فضا اسقدر پُراسرار رہتی کہ طبیعت کو سکون نہ ہوتا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ پتے اب بھی گرتے تھے مگر اب کونپلیں بھی پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ درختوں کی شاخوں میں سے زرد زرد شگوفے نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ شاعروں نے جو بہار کے موسم کو جنوں کا موسم کہا ہے تو کچھ غلط نہیں ہے اس لئے کہ اس بہار کی ہواؤں اور میری قیدِ تنہائی کی مصیبت نے مجھ میں جنوں کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں پہروں چپ چاپ لیٹا رہتا۔ کوئی خیال، کوئی تصور، کوئی جذبہ، کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے اندر اور اپنے باہر ویرانی ہی ویرانی نظر آتی۔ کوئی پھول، خوشبو کا کوئی تصور، حسن کی کوئی تصویر نظر کے سامنے نہ تھی۔ نظروں کے سامنے نہ تو پھول تھے اور نہ زلفوں کے لہراتے ہوئے سانپ تھے۔ زلف و لب و رخسار کے افسانے بھولتے جا رہے تھے۔ زندگی میں کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

میرے کبوتر اسی طرح تھے۔ میں انہیں اپنے چنے اور بچی ہوئی روٹیاں ڈال دیتا اور وہ اسی طرح میری گود میں آکر بیٹھے رہتے۔ میری کوٹھڑی کی چھت میں بجلی کی تار کے ساتھ بئے کا جو گھونسلہ تھا اسے بلب لگاتے وقت اتار کر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ معلوم کدھر چلا گیا۔ میں بہت دنوں اس بیچارے کی تقدیر کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ تو پہلے ہی پریشان حال 'دنیا کا ستایا ہوا تھا۔ اب وہ کہاں ہوگا؟ میں معمول کے مطابق صبح یوگا کے آسن لگا کر سادھی لگاتا اور گیان دھیان میں لگا رہتا۔ ماسٹر صاحب آتے اور اخبار دیکر اور "یہ تو بُرے آثار ہیں خانی" کہہ کر رخصت ہو جاتے۔ میرے سامنے وقت اور فاصلے اور زندگی اور موت کا کوئی تصور باقی نہیں رہا تھا۔

اسی بے حسی اور جمود کے عالم میں فروری اور مارچ کا مہینہ گزر گیا۔ کتنے ہی نئے شگوفے

پھوٹے، کتنی ہی کونپلیں نکلیں مگر اس زندگی میں بہار کا نشان نہ تھا۔ بہار جیسے ان اونچی، بھوری دیواروں کو پھاندنے سے معذور تھی۔

پچھلے کئی ماہ سے ڈپٹی صاحب روزانہ صبح سویرے جمعداروں، سپاہیوں اور نمبرداروں کی ایک فوج لے کر آ جاتے اور میرے سامان کی مکمل تلاشی لیتے۔ وہ کہتے تھے کہ حکومت کا حکم آیا ہے کہ پھانسی والوں کی روزانہ تلاشی کے ساتھ ساتھ سیاسی نظربندوں کی تلاشی بھی روزانہ ہونی چاہیئے۔ تلاشی لینے کا طریقہ اگرچہ حد درجہ اہانت آمیز تھا اور اگرچہ چھ ماہ تلاشی لیتے رہنے کے باوجود میرے پاس سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی تھی مگر میں اس وجہ سے چپ ہو رہتا کہ چلو اس بہانے ڈپٹی صاحب سے گپ ہی ہو جاتی ہے۔

ایک صبح کو سویرے سویرے ڈپٹی صاحب آتے وقت سویٹ پیز (Sweet Peas) کا ایک گلدستہ لے آئے تو میری عید ہو گئی۔ میں نے ان کے ہاتھ سے پھول لیتے ہوئے کہا ؎

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

انہوں نے میرا یہ شوق دیکھا تو روزانہ مجھے پھول بھیجنے لگے۔ انکی خوشبو اور دلفریبی سے میں اسقدر مسحور ہوتا کہ گھنٹوں ان کو منہ سے لگائے بیٹھا رہتا۔

اپریل کے شروع میں ایک صبح ڈپٹی صاحب نے آ کر مجھ سے کہا "بوریہ بستر سمیٹ کر تیار ہو جاؤ"

"کہاں چلنے کے لئے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"حسن عابدی کے پاس!" انہوں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ان سے معلوم ہوا کہ ہمیں ایک ساتھ رکھنے کے احکامات موصول ہو گئے ہیں۔ وجہ یہ بھی کہ خود جیل والوں نے لکھا تھا کہ دو اے کلاس نظر بندوں کو الگ الگ رکھنے کی جگہ اس جیل میں نہیں تھی، پھر راشن اور مشقتی بھی الگ الگ دینے پڑتے تھے جس میں جیل والوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ خاص طور پر اس لئے بھی کیونکہ یہ جیل چھوٹی تھی اور برتن وغیرہ بھی اتنے نہیں تھے کہ دو آدمیوں کو الگ الگ دئے جا سکتے۔ بہرحال میں نے خوشی خوشی اپنا سامان باندھا اور مشقتیوں کے سر پہ رکھوا کر ڈپٹی صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

حسن عابدی کے احاطہ میں جانے کے لئے چکر میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا جب ہم لوگ چکر میں پہنچے تو وہاں عجیب نقشہ نظروں کے سامنے دیکھا چیف ہیڈ وارڈر اور بہت سے سپاہی اور جمعدار ایک بڈھے کو گھیرے کھڑے تھے، بڈھا ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے ڈانٹ کر ملازموں سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟ یہاں پر کیا ہو رہا ہے؟"

چیف وارڈر نے آگے بڑھ کر کہا "جناب! اس بڈھے کی رہائی کے احکامات آئے ہیں مگر یہ جاتا نہیں ہے"

معلوم ہوا کہ بڈھے کو ہفتہ بھر پہلے گداگری کے انسداد کے سلسلے میں جیل بھیج دیا گیا تھا مگر اب چونکہ حکام کے خیال میں گداگری کی لعنت ختم ہو گئی تھی اس لئے ان کو چھوڑا جا رہا تھا۔ مگر یہ بڈھا بضد تھا کہ اسے رہا نہ کیا جائے۔

ڈپٹی صاحب نے اسے رہا ہونے پہ مجبور کیا تو وہ ان کے قدموں پر گر پڑا اور روتے ہوئے کہنے لگا "بچیاں والیا! چار دن پیٹ بھر کر روٹی کھا لینے دے۔ بس دس دن اور

مجھے یہیں رہنے دے۔ باہر تو کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملا۔ یہاں کم از کم دو وقت روٹی تو مل جاتی ہے"

ڈپٹی صاحب نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی اور اس سے کہا کہ اس کی رہائی کے احکامات آنے کے بعد اسے اب وہ جیل میں نہیں رکھ سکتے۔ مگر وہ ہاتھ باندھ کر منت سماجت کئے جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "جناب! میں آپکے بچوں کی درازیٔ عمر کی دعائیں کرونگا۔ میں بے وسیلہ ہوں۔ باہر آٹا بہت مہنگا ہے اور کھانے کو کوئی نہیں دیتا۔ یہاں تو روٹی ملتی ہے۔ حضور، جناب! مجھے دس دن اور یہاں پر کاٹ لینے دو"

بڑی مشکلوں سے اس بڈھے کو دھکے دے کر جیل سے باہر نکالا گیا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ دو چار روز کے بعد پھر آیا ہوگا اس لئے کہ بھوکے کو روٹی نہ ملے تو اس کے لئے جیل کی غلامی آزادی کے بھوکا مرنے سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ اس کی زندہ مثال سامنے تھی۔

حسن عابدی نے مجھے دیکھا تو پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر وہ لپٹ کر گلے مل گیا۔ لاہور میں ہم لوگ پندرہ روز ساتھ رہے، پھر جولائی سے لیکر اس مارچ کے مہینے تک اسی جیل میں رہے لیکن الگ الگ، اس لئے جب ملے تو ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ اسے دیکھکر مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ اسے اگرچہ مجھ سے بہت پہلے بہتر کلاس مل گئی تھی لیکن وہ مجھ سے زیادہ اذیت برداشت کر چکا ہے۔ کیونکہ اسکے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اور اسکے ہونٹ خشک نظر آ رہے تھے۔ اس ایک سال کے عرصے میں اس سے ملاقات کرنے کیلئے کوئی نہ آیا تھا۔ کسی نے اسے باہر سے کوئی تحفہ، زندگی کی کوئی خوشبو یا کوئی پیغام نہ بھیجا تھا۔ اسے اسوقت تک سگریٹ بھی نہ ملے تھے، کلاس بہتر ہونے کے باوجود اسے کپڑے

دھونے کے لئے صابن نہ ملا تھا۔ بلکہ سال بھر جیل میں رہنے کے بعد اسکے کپڑے تک پھٹ چکے تھے۔ شیو کا سامان بھی اسے اس وقت تک نہیں ملا تھا۔

اس روز آپس میں ملنے کے ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ ہم دن بھر سگریٹ اور بیڑیاں پھونکتے اور گپ لگاتے رہے۔ اس کا احاطہ میرے احاطہ سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ چنانچہ ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر احاطہ کی چار دیواری میں ٹہلتے اور اپنی سال بھر کی جُدائی کے قصے ایکدوسرے کو سُناتے رہے۔ اس احاطے میں بیری کا ایک درخت بھی تھا۔ ہم نے اس درخت پر چڑھ کر بیر کھائے۔ شام کو باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کا کام شروع کیا تو اگلی صبح تک ہنستے رہے۔ اس پہلی رات میں ہم ایک منٹ کیلئے بھی نہ سو سکے۔ باتیں اور باتیں کرنے کی پیاس اسقدر زیادہ تھی کہ کئی دن تک ہم نان سٹاپ بولتے رہے۔

حسن عابدی کا مشقتی کوئی گرہ کٹ تھا۔ وہ ہمارا راشن لینے کے لئے سٹور میں جاتا تو کسی حوالاتی سے بیڑیوں کا بنڈل، کسی سے اپنے لئے جُوتا یا کوئی اور ضرورت کی چیز اُڑا لاتا یا چُرا لاتا۔ حسن عابدی نے مجھے بتایا کہ ابھی دو ماہ پیشتر وہ رہا ہوا تھا مگر چار ہی دن بعد واپس آگیا۔ واپس آکر وہ تمام قیدیوں سے "السلام علیکم، السلام علیکم" کہہ کر بڑے تپاک سے ملتا رہا گویا بڑے لمبے سفر سے واپس آیا ہو۔ یہ مشقتی جُوا بھی بہت کھیلتا تھا۔ جب جیل کے ملازموں کی نگرانی بہت بڑھ جاتی تو وہ صبح قیدیوں کے ہمراہ اپنی بیرک سے نکلتے وقت اپنی جُوتی ہاتھ میں لے لیتا اور کسی قیدی سے کہتا "بول سیدھی جُوتی یا اُلٹی؟"

قیدی کچھ مان لیتا تو یہ شخص چلتے چلتے جُوتی ہوا میں اُچھال دیتا۔ اگر جیت جاتا تو اس جُوتی

کے ساتھ اس قیدی کی جوتی بھی لے آتا اور کہیں بیچ دیتا۔ اگر ہار جاتا تو اپنی جوتی بھی دے آتا اور شام کو کوئی دوسری کہیں سے مار لاتا۔ دو تین ماہ سے اسے کوئی ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ چنانچہ ایک روز وہ منشی سے ایک کارڈ لے آیا اور مجھ سے کہنے لگا "جناب! میرے گھر ایک خط تو لکھ دیجئے۔ منشی سالے تو دس دس دن منتیں کراتے ہیں"

مجھے چونکہ قلم دوات رکھنے کی اجازت مل چکی تھی اس لئے میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اس سے بولنے کے لئے کہا۔ اس نے خط لکھوانا شروع کیا:۔

جناب والدہ صاحبہ!

السلام علیکم کے بعد واضح ہو کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ میں آپ کے لئے اور آپ میرے لئے مر چکے ہیں میں سخت بیمار ہوں اور مرنے کے قریب ہوں۔ زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اگر آپ لوگوں کو میرا منہ دیکھنا ہے تو ایک بار آ کر منہ دیکھ جائیے اور اپنا منہ بھی مجھ کو آخری وقت دکھا جائیے۔ آتے وقت پانچ سیر گڑ، دو سیر صابن، چالیس بیڑی کے بنڈل، ایک پمپ کا شو، پانچ سیر گھی، چار ٹکیہ نہانے کا صابن، دو سیر سرسوں کا تیل اور.......

میں نے کہا "او حرامزادے! تو مر رہا ہے پھر یہ سب سامان کس لئے منگواتا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا "تسیں لکھو تاں سہی جناب!" میں نے لکھ دیا۔

اپریل کا مہینہ حسن عابدی کے احاطہ میں گزرا۔ ملتان میں اپریل ہی سے گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ مئی کی نو تاریخ کو میری دوسری ششماہی کی میعاد ختم ہوتی تھی۔ حسن عابدی نے

بیس اپریل ۵۲ء کو اپنا ایک سال پورا کر لیا تھا اور اسے مزید چھ ماہ کی نظربندی کے احکامات مل چکے تھے میرے لئے ابھی انتظار کے دس دن باقی تھے۔ یہی امید تھی کہ شاید میں بھی حسن عابدی کے ساتھ اور چھ مہینے بند رہوں۔ گرمیوں کا موسم پھر منہ کھولے سامنے کھڑا تھا۔

مئی کی ابتدائی تاریخوں کو ہمیں باہر سونے کی اجازت مل گئی۔ سال بھر کے بعد کھلے آسمان کے نیچے لیٹ کر ہم نے دیر تک ستاروں کی فروزاں شمعوں کو دیکھا اور نیلے آسمان اور اسکی پہنائیوں کے متعلق غور کرتے رہے۔ سال بھر کے بعد ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ صبح سویرے اُٹھ کر ٹہل سکیں اور اپنے احاطہ کی طرف آتی ہوئی اور گنگناتی ہوئی صبح کو دیکھ سکیں۔

اس احاطہ میں بے شمار درخت تھے۔ ان درختوں پر رات بھر اُلّو بولتے۔ میں اور حسن عابدی اپنے بستروں سے اُٹھ کر اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر ان اُلّوؤں کو مارنے کی کوشش کرتے، مگر اندھیرے میں ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اندھیرے میں صرف اُلّو کی آنکھ ہی کھلی رہتی ہے اسی لئے تو ہم دونوں اندھیرے میں اپنے ان جرموں کی تلاش کرتے رہتے جن کی سزا ہمیں مل رہی تھی مگر ہمیں اپنے ایسے کوئی جرم نظر نہ آتے تھے لیکن دیکھنے والے دیکھ چکے تھے اور ہمیں نہیں بتاتے تھے۔ ہم مکمل اندھیرے میں تھے۔

کبھی کبھی صبح سویرے کوئی بلبل ہمارے احاطہ کے درختوں پر آ بیٹھتا اور اپنی لمبی فریادی آواز میں گانے لگتا۔ بہار کی یہ صبحیں کس قدر دلفریب اور کتنی پُرنور تھیں، اور بلبلوں کے یہ نغمے کیسے جادو بھرے تھے لیکن یہ ساری مسرت اور خوشی ہمارے اندر کی غمگینی سے ٹکرا کر جیسے لوٹ آتی۔ ہم بلبلوں کے نغموں سے اور بھی زیادہ پریشان اور غمگین ہو جاتے۔ مگر صبح سویرے

ہم دونوں میں سے جس کے کان میں سب سے پہلے اس نغمہ کی آواز آتی وہ دوسرے کو جگا ضرور دیتا اور پھر ہم دونوں بیٹھ کر یہ آواز سنتے رہتے۔ پھر صبح ہوتی، ہم چائے پیتے اور اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ حسن عابدی کی کشمکش ختم ہو چکی تھی مگر میں ابھی امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جوں جوں نو مئی کی تاریخ قریب آرہی تھی، یہ کشمکش بڑھتی جاتی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ چھ ماہ کی مزید نظربندی کے احکامات موصول ہوں گے یا رہا ہو جاؤں گا فیصلہ کرنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ جس طرح بغیر جرم کے پہلے ایک سال جیل میں رکھا گیا ہوں ویسے اور بھی سال دو سال تک رکھا جا سکتا ہوں مگر چونکہ بعض ساتھی رہا بھی ہو چکے تھے اس لئے یہ امید بھی تھی کہ شاید رہا ہو جاؤں۔

آخر ۹ مئی کی صبح آ پہنچی۔ میں نے اپنا سامان نہیں باندھا بلکہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ حسن عابدی اور میں بار بار دروازے کی طرف دیکھتے تھے۔ لیکن اس روز آٹھ بجے تک کوئی نہیں آیا۔

آٹھ بجے اچانک ڈیوڑھی سے ایک نمبردار مجھے لینے کے لئے آگیا۔ اس نے مجھے اپنا سامان بھی ساتھ لینے کو کہا۔ آخر رہائی کی تاریخ آ گئی تھی مگر کوئی اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ڈیوڑھی پہنچ کر مجھے بتا دیا جائے کہ تمہاری نظربندی کی توسیع کے احکامات ٹیلیفون پر موصول ہو گئے ہیں اس لئے واپس چلے جاؤ۔ قانون ہی ایسا ہے کہ سب اعتبار اٹھ گئے تھے۔ میں جب چلنے لگا تو حسن عابدی سے گلے ملا۔ اس نے

گلے ملتے ہوئے مجھ سے کہا " باہر جا کر صرف ایک کام کرنا۔ کسی طرح یہ معلوم کرنا کہ میں نے کیا جرم کیا ہے ؟ مجھے ابھی تک اپنا کوئی قانونی جرم معلوم نہیں ہے۔ اگر تم معلوم کر کے بتا دو تو بڑی نوازش ہو گی "

اور آج جبکہ مجھے رہا ہوئے تقریباً نو ماہ ہو چکے ہیں اور جبکہ حسن عابدی اب تک ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں پڑا سڑ رہا ہے، میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ بڑی تلاش کے باوجود مجھے حسن عابدی کے جرم کی کوئی فہرست نہیں ملی۔ میں کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکا کہ حسن عابدی پونے دو سال سے کس لئے نظر بند ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں سال بھر کس لئے نظر بند رہا ہوں ——— میری زندگی کا ایک سال، پورے تین سو پینسٹھ دن میری مجموعی زندگی سے کس لئے الگ کر دئے گئے تھے اور میں سال بھر ساری دنیا سے الگ کر کے کس لئے قیدِ تنہائی کے کنوئیں میں غرق کر دیا گیا تھا۔

مجھے صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ میں زندگی سے ایک سال تک بچھڑا رہا ہوں میں ابھی تک اپنے آپ کو ویسا نہیں پا رہا ہوں جیسا میں ۹ مئی ۵۱ء کو گرفتار ہوتے وقت تھا۔ میں زندگی سے پیچھے رہ گیا ہوں اور یہ حسین سرسبز و شاداب زندگی جو میری نظر کے سامنے پھیلی ہوئی ہے مجھے بالکل اجنبی، بالکل ویران سی نظر آتی ہے۔ جس کے حسن اور نغموں اور خوشبوؤں اور بہاروں کے لئے میں روتا رہتا تھا۔ وہ اُجڑی اُجڑی سی معلوم ہوتی ہے۔ میں دن بھر اس کے پیچھے پیچھے بھاگا پھرتا ہوں اور اسے اپنے کمزور بازوؤں کی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ میرے بس میں

نہیں آتی۔

اکثر جب میں دن بھر زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہنے اور بادِ مخالف کے تھپیڑے کھانے کے بعد تھک ہار کر رات گئے اپنے گھر میں آکر اپنے بستر پر دراز ہوتا ہوں اور جب میری بہن مجھے دیر سے آنے پر ڈانٹتی ہے اور جب وہ سینے کے درد سے چلا کر کروٹ بدلتی ہے اور جب میں جاگتا ہوا ہونے کے باوجود انجان بننے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے وہ بڈھا یاد آجاتا ہے جس نے شیخ محمد شریف ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ملتان جیل سے ہاتھ باندھ کر کہا تھا "بچیاں والیا! مجھے رہا نہ کر، دس دن اور یہاں پر گزار لینے دے —— باہر تو کوئی روٹی نہیں دیتا —— باہر زندہ رہنا تو بڑا مشکل کام ہے ——"